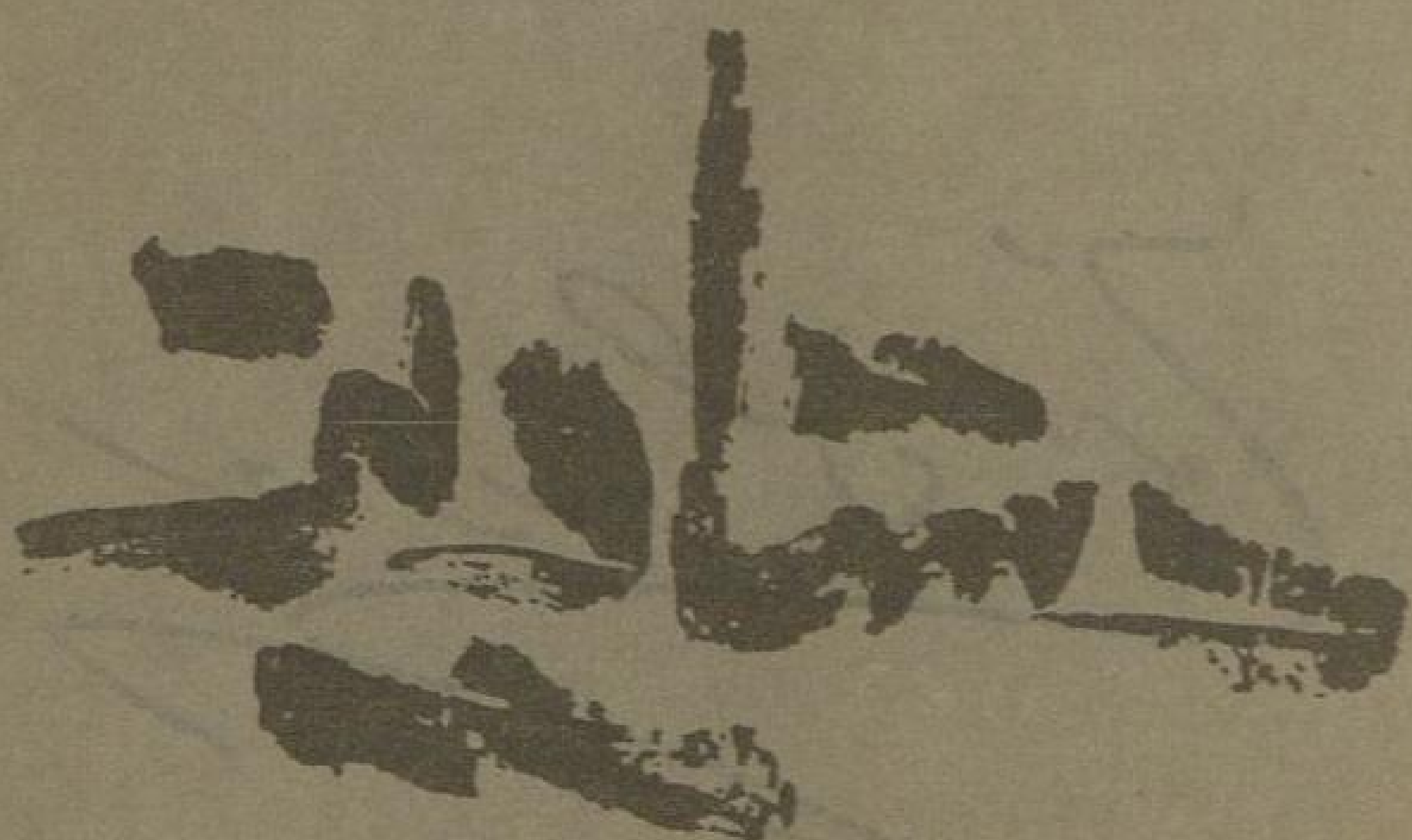
دستاویز

منٹو



سعادت حسن منٹو



سعادت حسن منٹو

پہلا لفظ

۷۸۶

"کتبہ"



یہاں
سعادت حسن منٹو
دفن ہے ——
اس کے سینے میں
فنِ افسانہ نگاری کے
سارے
اسرار و رموز
دفن ہیں ——
وہ
اب بھی
منوں مٹی کے نیچے
سوچ رہا ہے
کہ
وہ
بڑا افسانہ نگار ہے
یا خدا۔

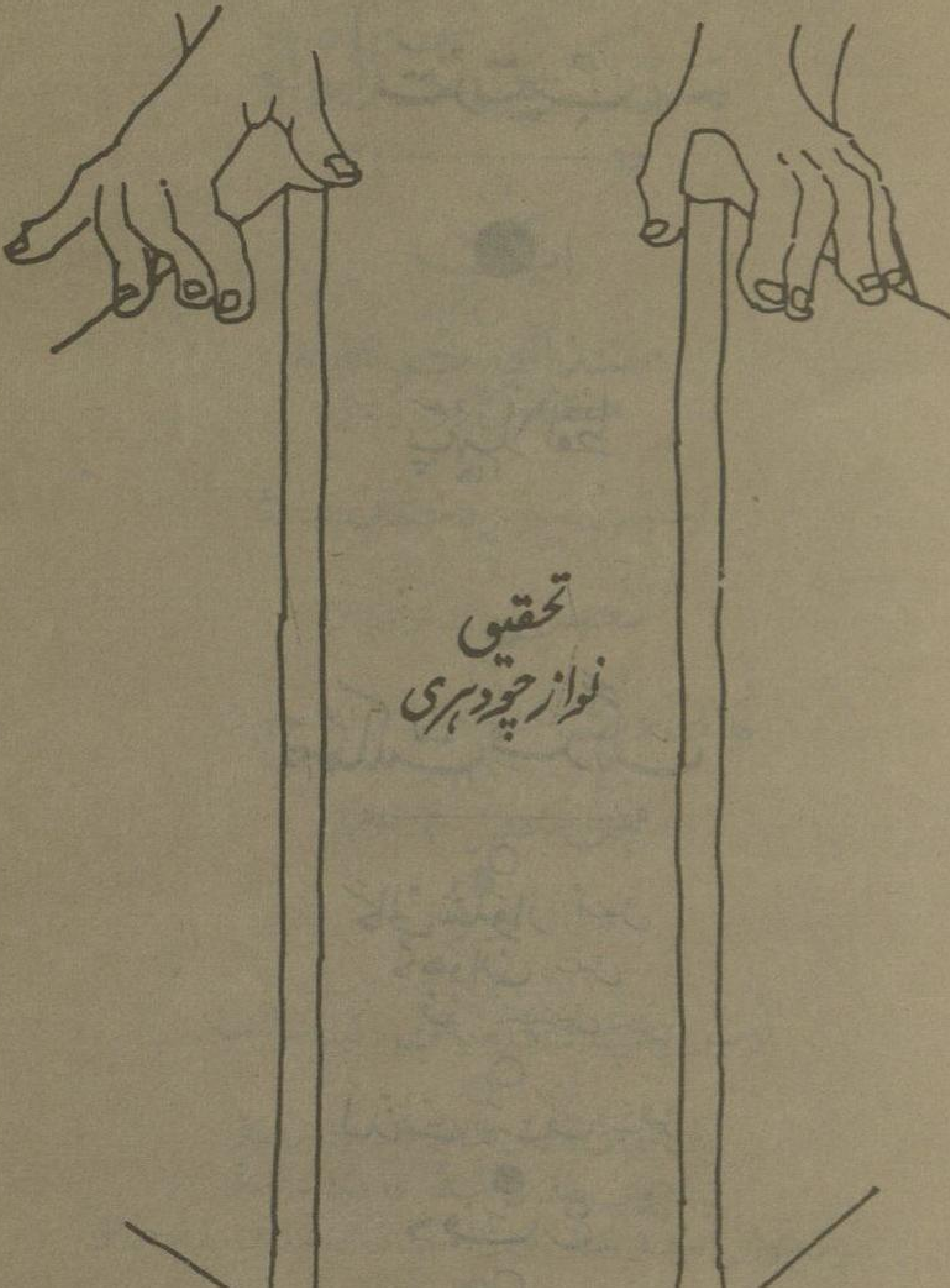
سعادت حسن منٹو

۱۸ اگست ۱۹۵۴ء



ترتیب

نواز چودہری



تحقیق

نواز چودھری

ترتیب

مملکتِ خداداد

۹۵ ———— ۱۸۹

ایک

دو

آخری لفظ

ناشر ۔۔۔۔ نواز چودھری
مطبع ۔۔۔۔ ندیم یونس پرنٹرز
لاہور
تعداد ۔۔۔۔۔۔ پانچسو
قیمت ۔۔۔ ساڑھے روپے

مکتبہ شعر و ادب سمن آباد ۔ لاہور

دستاویز

مملکتِ فرنگ

کالی شلوار
دھواں
بُو

لذتِ سنگ

سفید جھوٹ
افسانہ نگار اور جنسی مسائل
کسوٹی
عصمت فروشی

کالی شلوار

دہلی آنے سے پہلے وہ انبالہ چھاؤنی میں تھی جہاں کئی گورے اس کے گاہک تھے۔ ان گوروں سے ملنے جلنے کے باعث وہ انگریزی کے دس پندرہ جملے سیکھ گئی تھی۔ ان کو وہ عام گفتگو میں استعمال نہیں کرتی تھی لیکن جب وہ دہلی میں آئی اور اس کا کاروبار نہ چلا تو ایک دن اس نے اپنی پڑوسن طمنچہ جان سے کہا: "دِس لیف، ویری بیڈ۔" یعنی یہ زندگی بہت بری ہے جبکہ کھانے ہی کو کچھ نہیں ملتا۔

انبالہ چھاؤنی میں اس کا دھندا بہت اچھی طرح چلتا تھا۔ چھاؤنی کے گورے شراب پی کر اس کے پاس آتے تھے اور وہ تین چار گھنٹوں ہی میں آٹھ دس گوروں کو نمٹا کر بیس تیس روپے پیدا کر لیا کرتی تھی۔ یہ گورے اس کے ہم وطنوں کے مقابلے میں بہت اچھے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایسی زبان بولتے تھے جس کا مطلب سلطانہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا مگر ان کی زبان سے یہ لاعلمی اس کے حق میں بہت اچھی ثابت ہوتی تھی۔ اگر وہ اس سے کچھ رعایت چاہتے تو وہ سر ہلا کر کہہ دیا کرتی تھی: "صاحب، ہماری سمجھ میں تمہاری بات نہیں آتا۔" اور اگر وہ اس سے ضرورت سے زیادہ چھیڑ چھاڑ کرتے تو وہ ان کو اپنی زبان میں گالیاں دینا شروع کر دیتی تھی۔ وہ حیرت میں اس کے منہ کی طرف دیکھتے تو وہ ان سے کہتی: "صاحب، تم ایک دم الو کا پٹھا ہے۔ حرامزادہ ہے

. . . سمجھا!" یہ کہتے وقت وہ اپنے لہجہ میں سختی پیدا نہ کرتی بلکہ بڑے پیار کے ساتھ ان سے باتیں کرتی —— گورے ہنس دیتے اور ہنستے وقت وہ سلطانہ کو بالکل الّو کے پٹھے دکھائی دیتے۔

مگر یہاں دلی میں وہ جب سے آئی تھی، ایک گورا بھی اس کے یہاں نہیں آیا تھا۔ تین مہینے اس کو ہندوستان کے اس شہر میں رہتے ہو گئے تھے جہاں اس نے سُنا تھا کہ بڑے لاٹ صاحب رہتے ہیں جو گرمیوں میں شملے چلے جاتے ہیں۔ —— اس کے پاس صرف چھ آدمی آئے تھے۔ صرف چھ، یعنی مہینے میں دو۔ اور ان چھ گاہکوں سے اس نے، خدا جھوٹ نہ بلوائے، ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کیے تھے۔ تین روپے سے زیادہ پر کوئی مانتا ہی نہیں تھا۔ سلطانہ نے ان میں سے پانچ آدمیوں کو اپنا ریٹ دس روپے بتایا تھا مگر تعجب کی بات ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے یہی کہا تھا: "بھئی ہم تین روپے سے زیادہ ایک کوڑی نہیں دیں گے . . ." جانے کیا بات تھی کہ ان میں سے ہر ایک نے اسے صرف تین روپے کے قابل سمجھا، چنانچہ جب چھٹا آیا تو اس نے خود اس سے کہا: "دیکھو، میں تین روپے ایک ٹیم کے لوں گی۔ اس سے ایک دھیلا تم کم کہو تو نہ ہو گا۔ اب تمھاری مرضی ہو تو رہو ورنہ جاؤ۔" چھٹے آدمی نے یہ بات سُن کر تکرار نہ کی اور اس کے ہاں ٹھیر گیا۔ جب دوسرے کمرے میں دروازے وروازے بند کر کے وہ اپنا کوٹ اُتارنے لگا تو سلطانہ نے کہا: "لائیے ایک روپیہ دُودھ کا۔" اس نے ایک روپیہ تو نہ دیا لیکن نئے بادشاہ کی چمکتی ہوئی اٹھنی جیب میں سے نکال کر اس کو دے دی اور سلطانہ نے بھی چپکے سے لے لی کہ چلو جو آیا ہے، غنیمت ہے۔

ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینوں میں —— بیس روپے ماہوار تو اس کوٹھے کا کرایہ تھا جس کو مالک مکان انگریزی زبان میں فلیٹ کہتا تھا۔ اس فلیٹ میں ایسا پاخانہ تھا جس میں زنجیر کھینچنے سے ساری گندگی پانی کے زور سے ایک دم نیچے نل میں غائب ہو جاتی تھی اور بڑا شور ہوتا تھا۔ شروع شروع میں تو اس شور نے اسے بہت ڈرایا تھا۔ پہلے دن جب وہ رفع حاجت کے لیے اس پاخانے میں گئی تو اس کی کمر میں شدت کا درد ہو رہا تھا۔ فارغ ہو کر جب اُٹھنے لگی تو اس نے لٹکی ہوئی زنجیر کا سہارا لے لیا۔ اس زنجیر کو دیکھ کر اس نے خیال کیا چونکہ یہ مکان خاص ہم لوگوں کی رہائش کے لیے تیار کیے گئے ہیں، یہ زنجیر اسی لیے لگائی گئی ہے کہ اُٹھتے وقت تکلیف نہ ہو اور سہارا مل جایا کرے مگر جونہی اس نے زنجیر کو پکڑ کر اُٹھنا چاہا، اوپر کھٹ کھٹ سی ہوئی اور پھر پانی ایک دم اس زور کے ساتھ باہر نکلا کہ ڈر کے مارے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

خدا بخش دوسرے کمرے میں اپنا فوٹو گرافی کا سامان درست کر رہا تھا اور ایک صاف بوتل میں ہائیڈرو کونین ڈال رہا تھا کہ اس نے سلطانہ کی چیخ سُنی۔ دوڑ کر وہ باہر نکلا اور سلطانہ سے پوچھا: "کیا ہوا . . . ؟ یہ چیخ تمھاری تھی . . . ؟"

سلطانہ کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس نے کہا: "یہ موا پیخانہ ہے یا کیا ہے۔ بیچ میں یہ ریل گاڑیوں کی طرح زنجیر کیا لٹکا رکھی ہے۔ میری کمر میں درد تھا، میں نے کہا، چلو اس کا سہارا لے لوں گی، پر اس موئی زنجیر کو چھیڑنا تھا کہ وہ دھماکا ہوا کہ میں تم سے کیا کہوں . . ."

اس پر خدا بخش بہت ہنسا تھا اور اس نے سلطانہ کو اس پیخانے کی بابت سب کچھ بتا دیا تھا کہ یہ نئے فیشن کا ہے جس میں زنجیر ہلانے سے سب گندگی زمین میں دھنس جاتی ہے۔

خدا بخش اور سلطانہ کا آپس میں کیسے سمبندھ ہوا، یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ خدا بخش راولپنڈی کا تھا۔

انٹرنس پاس کرنے کے بعد اس نے لاری چلانا سیکھی۔ چنانچہ چار برس تک وہ راولپنڈی اور کشمیر کے درمیان لاری چلانے کا کام کرتا رہا۔ اس کے بعد کشمیر میں اس کی دوستی ایک عورت سے ہو گئی۔ اس کو بھگا کر وہ ساتھ لے آیا۔ لاہور میں چونکہ اس کو کوئی کام نہ ملا، اس لیے اس نے عورت کو پیشے پر بٹھا دیا۔ دو تین برس تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر وہ عورت کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی۔ خدا بخش کو معلوم ہوا کہ وہ انبالہ میں ہے، وہ اس کی تلاش میں آیا جہاں اس کو سلطانہ مل گئی۔ سلطانہ نے اس کو پسند کیا۔ چنانچہ دونوں کا سمبندھ ہو گیا۔

خدا بخش کے آنے سے ایک دم سلطانہ کا کاروبار چمک اٹھا۔ عورت چونکہ ضعیف الاعتقاد تھی، اس لیے اس نے سمجھا کہ خدا بخش بڑا بھاگوان ہے جس کے آنے سے اتنی ترقی ہو گئی ہے۔ چنانچہ اس خوش اعتقادی نے خدا بخش کی وقعت اس کی نظروں میں اور بھی بڑھا دی۔

خدا بخش آدمی محنتی تھا۔ سارا دن ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک فوٹوگرافر سے دوستی پیدا کی جو ریلوے اسٹیشن کے باہر منٹ کیمرے سے فوٹو کھینچا کرتا تھا۔ اس سے اس نے فوٹو کھینچنا سیکھا۔ پھر سلطانہ سے ساٹھ روپے لے کر کیمرہ بھی خرید لیا۔ آہستہ آہستہ ایک پردہ بنوایا، دو کرسیاں خریدیں اور فوٹو دھونے کا سب سامان لے کر اس نے علیحدہ اپنا کام شروع کر دیا۔

کام چل نکلا۔ چنانچہ اس نے تھوڑی ہی دیر کے بعد اپنا اڈا انبالے چھاؤنی میں قائم کر دیا۔ یہاں وہ گوروں کے فوٹو کھینچتا۔ ایک مہینے کے اندر اندر اس کی چھاؤنی کے متعدد گوروں سے واقفیت ہو گئی۔ چنانچہ وہ سلطانہ کو وہیں لے گیا۔ یہاں چھاؤنی میں خدا بخش کے ذریعہ سے کئی گورے سلطانہ کے مستقل گاہک بن گئے۔

سلطانہ نے کانوں کے لیے بندے خریدے۔ ساڑھے پانچ تولے کی آٹھ کنگنیاں بھی بنوائیں۔ دس پندرہ اچھی اچھی ساڑھیاں بھی جمع کر لیں۔ گھر میں فرنیچر وغیرہ بھی آ گیا۔ قصہ مختصر یہ کہ انبالہ چھاؤنی میں وہ بڑی خوش حال تھی مگر ایکا ایکی جانے خدا بخش کے دل میں کیا سمائی کہ اس نے دلی جانے کی ٹھان لی۔ سلطانہ انکار کیسے کرتی جبکہ خدا بخش کو اپنے لیے بہت مبارک خیال کرتی تھی۔ اس نے خوشی خوشی دلی جانا قبول کر لیا۔ بلکہ اس نے یہ بھی سوچا کہ اتنے بڑے شہر میں جہاں لاٹ صاحب رہتے ہیں، اس کا دھندا اور بھی اچھا چلے گا۔ اپنی سہیلیوں سے وہ دلی کی تعریف سن چکی تھی۔ پھر وہاں حضرت نظام الدین اولیا کی خانقاہ تھی جس سے اسے بے حد عقیدت تھی۔ چنانچہ جلدی جلدی گھر کا بھاری سامان بیچ باچ کر وہ خدا بخش کے ساتھ دلی آ گئی۔ یہاں پہنچ کر خدا بخش نے بیس روپے ماہوار پر ایک فلیٹ لیا جس میں دونوں رہنے لگے۔

ایک ہی قسم کے نئے مکانوں کی لمبی سی قطار سڑک کے ساتھ ساتھ چلی گئی ہے۔ میونسپل کمیٹی نے شہر کا یہ حصہ خاص کسبیوں کے لیے مقرر کر دیا تھا تاکہ وہ شہر میں جگہ جگہ اپنے اڈے نہ بنائیں۔ نیچے دکانیں تھیں اور اوپر دو منزلہ رہائشی فلیٹ۔ چونکہ سب عمارتیں ایک ہی ڈیزائن کی ہیں، اس لیے شروع شروع میں سلطانہ کو اپنا فلیٹ تلاش کرنے میں بہت دقت محسوس ہوتی تھی۔ پر جب نیچے لانڈری والے نے اپنا بورڈ گھر کی پیشانی پر لگا دیا تو اس کو ایک پکی نشانی مل گئی ——— "یہاں میلے کپڑوں کی دھلائی کی جاتی ہے۔" یہ بورڈ پڑھتے ہی وہ اپنا فلیٹ تلاش کر لیا کرتی تھی۔ اسی طرح اس نے اور بہت سی نشانیاں قائم کر لی تھیں: مثلاً بڑے بڑے حروف میں جہاں "کوئلوں کی دکان" لکھا تھا، وہاں اس کی سہیلی ہیرا بائی رہتی تھی جو کبھی کبھی ریڈیو گھر میں گانے جایا کرتی تھی۔ جہاں "شرفا کے لیے کھانے کا اعلیٰ انتظام ہے" لکھا تھا وہاں اس کی

دوسری سہیلی مختار رہی تھی۔ نواڑ کے کارخانہ کے اوپر انوری رہتی تھی جو اسی کارخانے کے سیٹھ کے پاس ملازم تھی۔ چونکہ سیٹھ صاحب کو رات کے وقت اپنے کارخانے کی دیکھ بھال کرنا ہوتی تھی، اس لیے وہ انوری کے پاس ہی رہتے تھے۔

دکان کھولتے ہی گاہک تھوڑے ہی آتے ہیں۔ چنانچہ جب ایک مہینے تک سلطانہ بیکار رہی تو اس نے یہی سوچ کر اپنے دل کو تسلی دی، پر جب دو مہینے گزر گئے اور کوئی آدمی اس کے کوٹھے پر نہ آیا تو اسے بہت تشویش ہوئی اس نے خدا بخش سے کہا: "کیا بات ہے خدا بخش، پورے دو مہینے ہو گئے ہیں ہمیں یہاں آئے ہوئے کسی نے ادھر کا رُخ بھی نہیں کیا۔ . . مانتی ہوں، آج کل بازار بہت مندا ہے، پر اتنا مندا بھی تو نہیں کہ مہینے بھر میں کوئی شکل دیکھنے ہی میں نہ آئے . . ."

خدا بخش کو بھی یہ بات بہت عرصہ سے کھٹک رہی تھی مگر وہ خاموش تھا، پر جب سلطانہ نے خود بات چھیڑی تو اس نے کہا: "میں کئی دنوں سے اس کی بابت سوچ رہا ہوں۔ ایک بات سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ کہ جنگ کی وجہ سے لوگ باگ دوسرے دھندوں میں پڑ کر ادھر کا رستہ بھول گئے ہیں . . . یا پھر یہ ہو سکتا ہے کہ . . ." وہ اس کے آگے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز آئی۔ خدا بخش اور سلطانہ دونوں اس آواز کی طرف متوجہ ہوئے۔ تھوڑی دیر کے بعد دستک ہوئی۔ خدا بخش نے لپک کر دروازہ کھولا۔ ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ یہ پہلا گاہک تھا جس سے تین روپے میں سودا طے ہوا۔ اس کے بعد پانچ اور آئے۔ یعنی تین مہینے میں چھ جن سے سلطانہ نے صرف ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کیے۔

بیس روپے ماہوار تو فلیٹ کے کرایہ میں چلے جاتے تھے، پانی کا ٹیکس اور بجلی کا بل جدا۔ اس کے علاوہ گھر کے دوسرے خرچ، کھانا پینا، کپڑے لتے، دوا دارو ——— اور آمدن کچھ بھی نہیں تھی۔ ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینے میں آئے تو اسے آمدن تو نہیں کہہ سکتے۔ سلطانہ پریشان ہو گئی۔ ساڑھے پانچ تولے کی آٹھ کنگنیاں جو اس نے انبالے میں بنوائی تھیں، آہستہ آہستہ بِک گئیں۔ آخری کنگنی کی جب باری آئی تو اس نے خدا بخش سے کہا: "تم میری سنو اور چلو واپس انبالے . . . یہاں کیا دھرا ہے . . .؟ بھئی ہو گا، پر ہمیں تو یہ شہر راس نہیں آیا۔ تمہارا کام بھی وہاں خوب چلتا تھا، چلو، وہیں چلتے ہیں۔ جو نقصان ہوا ہے، اس کو اپنا سر صدقہ سمجھو۔ اس کنگنی کو بیچ کر آؤ۔ میں اسباب وغیرہ باندھ کر تیار رکھتی ہوں۔ آج رات کی گاڑی سے یہاں سے چل دیں گے . . ."

خدا بخش نے کنگنی سلطانہ کے ہاتھ سے لے لی اور کہا: "نہیں جانِ من! انبالے نہیں جائیں گے۔ یہیں دہلی میں رہ کر کمائیں گے۔ یہ تمہاری چوڑیاں سب کی سب یہیں واپس آئیں گی۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔ وہ بڑا کارساز ہے۔ یہاں بھی وہ کوئی نہ کوئی اسباب بنا ہی دے گا۔"

سلطانہ چپ ہو رہی۔ چنانچہ آخری کنگنی بھی ہاتھ سے اُتر گئی۔ بُچّے ہاتھ دیکھ کر اس کو بہت دکھ ہوتا تھا۔ پر کیا کرتی، پیٹ بھی تو آخر کسی حیلے سے بھرنا تھا۔

جب پانچ مہینے گزر گئے اور آمدن خرچ کے مقابلے میں چوتھائی سے بھی کچھ کم رہی تو سلطانہ کی پریشانی اور زیادہ بڑھ گئی۔ خدا بخش بھی سارا دن اب گھر سے غائب رہنے لگا تھا۔ سلطانہ کو اس کا بھی دُکھ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پڑوس میں اس کی دو تین ملنے والیاں موجود تھیں جن کے ساتھ وہ اپنا وقت کاٹ سکتی تھی۔ پر ہر روز ان کے یہاں جانا اور گھنٹوں بیٹھے رہنا اس کو بہت بُرا لگتا تھا۔ چنانچہ آہستہ آہستہ اس نے ان سہیلیوں

ے ملنا جلنا بالکل ترک کر دیا۔ سارا دن وہ اپنے سنسان مکان میں بیٹھی رہتی۔ کبھی چھالیہ کاٹتی رہتی، کبھی اپنے پرانے اور پھٹے ہوئے کپڑوں کو سیتی رہتی اور کبھی باہر بالکنی میں آ کر جنگلے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو جاتی اور سامنے ریلوے شیڈ میں ساکت اور متحرک انجنوں کی طرف گھنٹوں بے مطلب دیکھتی رہتی۔

سڑک کی دوسری طرف مال گودام تھا جو اس کونے سے اس کونے تک پھیلا ہوا تھا۔ داہنے ہاتھ کو لوہے کی چھت کے نیچے بڑی بڑی گانٹھیں پڑی رہتی تھیں اور ہر قسم کے مال و اسباب کے ڈھیر سے لگے رہتے تھے۔ بائیں ہاتھ کو کھلا میدان تھا جس میں بے شمار ریل کی پٹریاں بچھی ہوئی تھیں۔ دھوپ میں لوہے کی یہ پٹریاں چمکتیں تو سلطانہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتی جن پر نیلی نیلی رگیں بالکل ان پٹریوں کی طرح ابھری رہتی تھیں۔ اس لمبے اور کھلے میدان میں ہر وقت انجن اور گاڑیاں چلتی رہتیں۔ کبھی ادھر کبھی اُدھر۔ ان انجنوں اور گاڑیوں کی چھک چھک پھک پھک سدا گونجتی رہتی تھی۔ صبح سویرے جب وہ اٹھ کر بالکنی میں آتی تو ایک عجیب سماں نظر آتا۔ دھندلکے میں انجنوں کے منہ سے گاڑھا گاڑھا دھواں نکلتا اور گدلے آسمان کی جانب موٹے اور بھاری آدمیوں کی طرح اٹھتا دکھائی دیتا۔ بھاپ کے بڑے بڑے بادل بھی ایک شور کے ساتھ پٹریوں سے اٹھتے اور آنکھ جھپکنے کی دیر میں ہوا کے اندر گھل مل جاتے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ گاڑی کے کسی ڈبے کو جسے انجن نے دھکا دے کر چھوڑ دیا ہو، اکیلے پٹریوں پر چلتا دیکھتی تو اسے اپنا خیال آتا۔ وہ سوچتی کہ اسے بھی کسی نے زندگی کی پٹری پر دھکا دے کر چھوڑ دیا ہے اور وہ خود بخود جا رہی ہے۔ دوسرے لوگ کانٹے بدل رہے ہیں اور وہ چلی جا رہی ہے . . . نہ جانے کہاں؟ پھر ایک روز ایسا آئے گا جب اس دھکے کا زور آہستہ آہستہ ختم ہو گا اور وہ کہیں رک جائے گی، کسی ایسے مقام پر جو اس کا دیکھا بھالا نہ ہو گا۔

یوں تو وہ بے مطلب گھنٹوں ریل کی ان ٹیڑھی بانکی پٹریوں اور ٹھیرے اور چلتے ہوئے انجنوں کی طرف دیکھتی رہتی تھی پر طرح طرح کے خیال اس کے دماغ میں آتے رہتے تھے۔ انبالہ چھاؤنی میں جب وہ رہتی تھی تو اسٹیشن کے پاس ہی اس کا مکان تھا مگر وہاں اس نے کبھی ان چیزوں کو ایسی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ اب تو کبھی کبھی اس کے دماغ میں یہ خیال بھی آتا کہ یہ جو سامنے ریل کی پٹریوں کا جال سا بچھا ہے اور جگہ جگہ سے بھاپ اور دھواں اٹھ رہا ہے، ایک بہت بڑا چکلہ ہے۔ بہت سی گاڑیاں ہیں جن کو چند موٹے موٹے انجن ادھر ادھر دھکیلتے رہتے ہیں ——— سلطانہ کو بعض اوقات یہ انجن سیٹھ معلوم ہوتے جو کبھی کبھی انبالہ میں اس کے ہاں آیا کرتے تھے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ کسی انجن کو آہستہ آہستہ گاڑیوں کی قطار کے پاس سے گزرتا دیکھتی تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ کوئی آدمی چکلے کے کسی بازار میں سے اوپر کوٹھوں کی طرف دیکھتا جا رہا ہے۔

سلطانہ سمجھتی تھی کہ ایسی باتیں سوچنا دماغ کی خرابی کا باعث ہے چنانچہ جب اس قسم کے خیال اس کو آنے لگے تو اس نے بالکنی میں جانا چھوڑ دیا۔ خدا بخش سے اس نے بارہا کہا: "دیکھو، میرے حال پر رحم کرو۔ یہاں گھر میں رہا کرو۔ میں سارا دن یہاں بیماروں کی طرح پڑی رہتی ہوں۔" مگر اس نے ہر بار سلطانہ سے یہ کہہ کر اس کی تشفی کر دی "جانِ من! میں باہر کچھ کمانے کی فکر کر رہا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو چند دنوں میں ہی بیڑا پار ہو جائے گا . . ."

پورے پانچ مہینے ہو گئے تھے مگر ابھی تک سلطانہ کا بیڑا پار ہوا تھا نہ خدا بخش کا۔ محرم کا مہینہ سر پر آ رہا تھا مگر سلطانہ کے پاس کالے کپڑے بنوانے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ مختار نے لیڈی ہیملٹن کی ایک نئی وضع کی قمیص بنوائی تھی جس کی آستینیں کالی جارجٹ کی تھیں۔ اس کے ساتھ میچ کرنے کے لیے اس کے پاس کالی

ساٹن کی شلوار تھی جو کاجل کی طرح چمکتی تھی۔ انوری نے ریشمی جارجٹ کی ایک بڑی نفیس ساڑھی خریدی تھی۔ اس نے سلطانہ سے کہا تھا کہ وہ اس ساڑھی کے نیچے سفید بوسکی کا پیٹی کوٹ پہنے گی کیونکہ یہ نیا فیشن ہے۔ اس ساڑھی کے ساتھ پہننے کو انوری کالی مخمل کا ایک جوتا لائی تھی جو بڑا نازک تھا۔ سلطانہ نے جب یہ تمام چیزیں دیکھیں تو اس کو اس احساس نے بہت دکھ دیا کہ وہ محرم منانے کے لیے ایسا لباس خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتی۔

انوری اور مختار کے پاس یہ لباس دیکھ کر جب وہ گھر آئی تو اس کا دل بہت مغموم تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک پھوڑا سا اس کے اندر پیدا ہو گیا ہے۔ گھر بالکل خالی تھا۔ خدا بخش حسبِ معمول باہر تھا۔ دیر تک وہ دری پر گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹی رہی۔ پر جب اس کی گردن اونچائی کے باعث اکڑ سی گئی تو وہ باہر بالکنی میں چلی گئی تاکہ غم افزا خیالات کو اپنے دماغ سے نکال دے۔

سامنے پٹریوں پر گاڑیوں کے ڈبے کھڑے تھے، پر انجن کوئی بھی نہ تھا —— شام کا وقت تھا۔ چھڑکاؤ ہو چکا تھا، اس لیے گرد و غبار دب گیا تھا۔ بازار میں ایسے آدمی چلنے شروع ہو گئے تھے جو تاک جھانک کرنے کے بعد چپ چاپ گھروں کا رُخ کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک آدمی نے گردن اونچی کر کے سلطانہ کی طرف دیکھا۔ سلطانہ مسکرا دی اور اس کو بھول گئی کیونکہ اب سامنے پٹریوں پر ایک انجن نمودار ہو گیا تھا۔ سلطانہ نے غور سے اس کی طرف دیکھنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ یہ خیال اس کے دماغ میں آیا کہ انجن نے بھی کالا لباس پہن رکھا ہے۔ یہ عجیب و غریب خیال دماغ میں سے نکالنے کی خاطر جب اس نے سڑک کی جانب دیکھا تو اسے وہی آدمی بیل گاڑی کے پاس کھڑا نظر آیا جس نے اس کی طرف للچائی نظروں سے دیکھا تھا۔ سلطانہ نے ہاتھ سے اسے اشارہ کیا۔ اس آدمی نے ادھر اُدھر دیکھ کر ایک لطیف اشارے سے پوچھا، کدھر سے آؤں۔ سلطانہ نے اسے راستہ بتا دیا۔ وہ آدمی تھوڑی دیر کھڑا رہا مگر پھر بڑی پھرتی سے اُوپر چلا آیا۔

سلطانہ نے اسے دری پر بٹھایا۔ جب وہ بیٹھ گیا تو اس نے سلسلۂ گفتگو شروع کرنے کے لیے کہا: ”آپ اوپر آتے ڈر کیوں رہے تھے؟“

وہ آدمی یہ سن کر مسکرایا: ”تمھیں کیسے معلوم ہوا . . . ڈرنے کی بات ہی کیا تھی؟“

اس پر سلطانہ نے کہا: ”یہ میں نے اس لیے کہا کہ آپ دیر تک وہیں کھڑے رہے اور پھر کچھ سوچ کر ادھر آئے . . .“

وہ یہ سن کر پھر مسکرایا: ”تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے . . . میں تمھارے اوپر والے فلیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہاں کوئی عورت کھڑی ایک مرد کو ٹھینگا دکھا رہی تھی۔ مجھے یہ منظر پسند آیا۔ پھر بالکنی میں سبز بلب روشن ہوا تو میں کچھ دیر کے لیے ٹھیر گیا۔ سبز روشنی مجھے پسند ہے۔ آنکھوں کو بہت اچھی لگتی ہے . . .“ یہ کہہ کر اس نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ پھر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

سلطانہ نے پوچھا: ”آپ جا رہے ہیں؟“

اس آدمی نے جواب دیا: ”نہیں، میں تمھارے اس مکان کو دیکھنا چاہتا ہوں . . . چلو، مجھے تمام کمرے دکھاؤ . . .“

سلطانہ نے اس کو تینوں کمرے ایک ایک کر کے دکھا دیے۔ اس آدمی نے بالکل خاموشی سے ان کمروں کا معائنہ کیا۔ جب وہ دونوں پھر اسی کمرے میں آ گئے جہاں پہلے بیٹھے تھے اس آدمی نے کہا: ”میرا نام شنکر ہے . . .“

سلطانہ نے پہلی بار غور سے شنکر کی طرف دیکھا۔ وہ متوسط قد کا معمولی شکل و صورت کا آدمی تھا مگر اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر صاف اور شفاف تھیں۔ کبھی کبھی ان میں ایک عجیب قسم کی چمک پیدا ہوتی تھی۔ گٹھیلا اور کسرتی بدن تھا۔ کنپٹیوں پر اس کے بال سفید ہو رہے تھے۔ خاکستری رنگ کی گرم پتلون پہنے تھا۔ سفید قمیص تھی جس کا کالر گردن پر سے اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔

شنکر کچھ اس طرح دری پر بیٹھا تھا کہ معلوم ہوتا تھا شنکر کے بجائے سلطانہ گاہک ہے۔ اس احساس نے سلطانہ کو قدرے پریشان کر دیا۔ چنانچہ اس نے شنکر سے کہا: "فرمائیے۔۔۔!"

شنکر بیٹھا تھا، یہ سن کر لیٹ گیا: "میں کیا فرماؤں، کچھ تم ہی فرماؤ۔ بلایا تمھیں نے ہے مجھے۔۔"

جب سلطانہ کچھ نہ بولی تو وہ اٹھ بیٹھا: "میں سمجھا۔۔۔ لو اب مجھ سے سنو۔ جو کچھ تم نے سمجھا ہے، غلط ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کچھ دے کر جاتے ہیں۔ ڈاکٹروں کی طرح میری بھی فیس ہے۔ مجھے جب بلایا جائے تو فیس دینا ہی پڑتی ہے۔۔۔"

سلطانہ یہ سن کر چکرا گئی مگر اس کے باوجود اسے بے اختیار ہنسی آگئی: "آپ کام کیا کرتے ہیں؟"

شنکر نے جواب دیا: "یہی جو تم لوگ کرتے ہو!"

"کیا؟"

"تم کیا کرتی ہو؟"

"میں۔۔۔ میں۔۔۔ میں کچھ بھی نہیں کرتی۔"

"میں بھی کچھ نہیں کرتا۔"

سلطانہ نے بھنا کر کہا: "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔۔۔ آپ کچھ نہ کچھ تو ضرور کرتے ہوں گے۔"

شنکر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا: "تم بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرتی ہو گی؟"

"میں جھک مارتی ہوں۔۔۔"

"میں بھی جھک مارتا ہوں۔۔۔"

"تو آؤ، دونوں جھک ماریں۔۔۔"

"حاضر ہوں مگر جھک مارنے کے دام میں کبھی نہیں دیا کرتا۔"

"ہوش کی دوا کرو۔۔۔ یہ لنگر خانہ نہیں۔۔۔"

"اور میں بھی والنٹیر نہیں۔۔۔"

سلطانہ اب رک گئی۔ اس نے پوچھا: "یہ والنٹیر کون ہوتے ہیں؟"

شنکر نے جواب دیا: "الو کے پٹھے۔۔۔"

"میں الو کی پٹھی نہیں۔۔۔"

"مگر وہ آدمی خدا بخش جو تمھارے ساتھ رہتا ہے، ضرور الو کا پٹھا ہے۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ وہ کئی دنوں سے ایک ایسے خدا رسیدہ فقیر کے پاس اپنی قسمت کھلوانے کی خاطر جا رہا ہے جس کی اپنی قسمت زنگ لگے تالے کی طرح بند ہے۔۔۔" یہ کہہ کر شنکر ہنسا۔

اس پر سلطانہ نے کہا: ”تم ہندو ہو، اسی لیے ہمارے ان بزرگوں کا مذاق اُڑاتے ہو۔۔۔“

شنکر مسکرایا: ”ایسی جگہوں پر ہندو مسلم سوال پیدا نہیں ہوا کرتے۔ بڑے بڑے پنڈت اور مولوی بھی یہاں آئیں تو شریف آدمی بن جائیں۔“

”جانے کیا اوٹ پٹانگ باتیں کرتے ہو۔۔۔ بولو، رہو گے؟“

”اسی شرط پر جو پہلے بتا چکا ہوں۔۔۔“

سلطانہ اُٹھ کھڑی ہوئی: ”تو جاؤ، رستہ پکڑو۔۔۔“

شنکر آرام سے اُٹھا، پتلون کی جیبوں میں اپنے دونوں ہاتھ ٹھونسے اور جاتے ہوئے کہا: ”میں کبھی کبھی اس بازار سے گزرا کرتا ہوں۔ جب بھی تمھیں میری ضرورت ہو، بلا لینا۔۔۔ بہت کام کا آدمی ہوں۔“

شنکر چلا گیا اور سلطانہ کالے لباس کو بھول کر دیر تک اس کے متعلق سوچتی رہی۔ اس آدمی کی باتوں نے اس کے دُکھ کو بہت ہلکا کر دیا تھا۔ اگر وہ انبالے میں آیا ہوتا جہاں کہ وہ خوشحال تھی تو اس نے کسی اور ہی رنگ میں اس آدمی کو دیکھا ہوتا اور بہت ممکن ہے کہ اسے دھکے دے کر باہر نکال دیا ہوتا۔ مگر یہاں چونکہ وہ بہت اُداس رہتی تھی، اس لیے شنکر کی باتیں اسے پسند آئیں۔

شام کو جب خدا بخش آیا تو سلطانہ نے اس سے پوچھا: ”تم آج سارا دن کدھر غائب رہے ہو؟“

خدا بخش تھک کر چُور چُور ہو رہا تھا۔ کہنے لگا: ”پرانے قلعہ کے پاس سے آ رہا ہوں۔ وہاں ایک بزرگ کچھ دنوں سے ٹھیرے ہوئے ہیں۔ انھی کے پاس ہر روز جاتا ہوں کہ ہمارے دن پھر جائیں۔۔۔“

”کچھ انھوں نے تم سے کہا؟“

”نہیں، ابھی وہ مہربان نہیں ہوئے۔۔۔ پر سلطانہ، مَیں جو ان کی خدمت کر رہا ہوں، وہ اکارت کبھی نہیں جائے گی۔ اللہ کا فضل شاملِ حال رہا تو ضرور وارے نیارے ہو جائیں گے۔“

سلطانہ کے دماغ میں محرّم منانے کا خیال سمایا ہوا تھا۔ خدا بخش سے رونی آواز میں کہنے لگی: ”تم سارا سارا دن باہر غائب رہتے ہو۔۔۔ میں یہاں پنجرے میں قید رہتی ہوں۔ کہیں جا سکتی ہوں، نہ آ سکتی ہوں۔ محرّم سر پر آ گیا ہے۔ کچھ تم نے اس کی بھی فکر کی کہ مجھے کالے کپڑے چاہئیں۔ گھر میں پھوٹی کوڑی تک نہیں۔ کنگنیاں تھیں سو وہ ایک ایک کر کے بِک گئیں۔ اب تم ہی بتاؤ، کیا ہو گا۔۔۔ یوں فقیروں کے پیچھے کب تک مارے مارے پھرا کرو گے۔ مجھے تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ یہاں دلّی میں خدا نے بھی ہم سے منہ موڑ لیا ہے۔ میری سنو تو اپنا کام شروع کر دو۔ کچھ تو سہارا ہو ہی جائے گا۔۔۔“

خدا بخش دری پر لیٹ گیا اور کہنے لگا: ”پر یہ کام شروع کرنے کے لیے بھی تو تھوڑا بہت سرمایہ چاہیے۔۔۔ خدا کے لیے اب ایسی دُکھ بھری باتیں نہ کرو۔ مجھ سے اب یہ برداشت نہیں ہو سکتیں۔ مَیں نے سچ مچ انبالہ چھوڑنے میں سخت غلطی کی۔ پر جو کرتا ہے، اللہ ہی کرتا ہے اور ہماری بہتری ہی کے لیے کرتا ہے۔ کیا پتہ ہے، کچھ دیر اور تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد ہم۔۔۔“

سلطانہ نے بات کاٹ کر کہا: ”تم خدا کے لیے کچھ کرو۔ چوری کرو یا ڈاکہ ڈالو پر مجھے ایک شلوار کا کپڑا ضرور لا دو۔ میرے پاس سفید بوسکی کی قمیص پڑی ہے، اس کو میں رنگوا لوں گی۔ سفید نینون کا ایک نیا دوپٹہ بھی میرے پاس موجود ہے، وہی جو تم نے مجھے دیوالی پر لا کر دیا تھا۔ یہ بھی قمیص کے ساتھ ہی رنگوا لیا

جائے گا۔ ایک صرف شلوار کی کسر ہے۔ سو وہ تم کسی نہ کسی طرح پیدا کر دو۔ ۔ ۔ دیکھو، تمھیں میری جان کی قسم، کسی نہ کسی طرح ضرور لادو۔ ۔ ۔ میری بھتی کھاؤ، اگر نہ لاؤ۔ ۔ ۔"

خدا بخش اٹھ بیٹھا: "اب تم خواہ مخواہ زور دیے چلی جا رہی ہو۔ ۔ ۔ میں کہاں سے لاؤں گا۔ ۔ ۔ افیم کھانے کے لیے تو میرے پاس ایک پیسہ تک نہیں۔ ۔ ۔"

"کچھ بھی کرو مگر مجھے ساڑھے چار گز کالی ساٹن لادو۔"

"دعا کرو کہ آج رات ہی اللہ دو تین آدمی بھیج دے۔ ۔ ۔"

"تم کچھ نہیں کرو گے۔ ۔ ۔ تم اگر چاہو تو ضرور اتنے پیسے پیدا کر سکتے ہو۔ ۔ ۔ جنگ سے پہلے یہ ساٹن بارہ چودہ آنے گز مل جاتی تھی، اب سوا روپے گز کے حساب سے ملتی ہے۔ ساڑھے چار گزوں پر کتنے روپے خرچ ہو جائیں گے؟"

"اب تم کہتی ہو تو میں کوئی حیلہ کروں گا۔" یہ کہہ کر خدا بخش اٹھا: "لو، اب ان باتوں کو بھول جاؤ۔ میں ہوٹل سے کھانا لے آؤں۔"

ہوٹل سے کھانا آیا۔ دونوں نے مل کر زہر مار کیا اور سو گئے۔ صبح ہوئی تو خدا بخش پرانے قلعے والے فقیر کے پاس چلا گیا اور سلطانہ اکیلی رہ گئی۔ کچھ دیر لیٹی رہی، کچھ دیر سوئی رہی۔ کچھ دیر ادھر ادھر کمروں میں ٹہلتی رہی—— دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد اس نے اپنا سفید نینون کا دوپٹہ اور سفید بوسکی کی قمیص نکالی اور نیچے لانڈری والے کو رنگنے کے لیے دے آئی۔ کپڑے دھونے کے علاوہ وہاں رنگنے کا کام بھی ہوتا تھا۔ یہ کام کرنے کے بعد اس نے واپس آکر فلموں کی کتابیں پڑھیں جن میں اس کے دیکھے ہوئے فلموں کی کہانی اور گیت چھپے ہوئے تھے۔ یہ کتابیں پڑھتے پڑھتے وہ سو گئی۔ جب اٹھی تو چار بج چکے تھے کیونکہ دھوپ آنگن میں سے موری کے پاس پہنچ چکی تھی۔ نہا دھو کر فارغ ہوئی تو گرم چادر اوڑھ کر بالکنی میں آ کھڑی ہوئی۔ قریباً ایک گھنٹہ سلطانہ بالکنی میں کھڑی رہی —— اب شام ہو گئی تھی۔ بتیاں روشن ہو رہی تھیں۔

نیچے سڑک میں رونق کے آثار نظر آنے لگے۔ سردی میں تھوڑی سی شدت ہو گئی مگر سلطانہ کو یہ ناگوار معلوم نہ ہوئی۔ وہ سڑک پر آتے جاتے تانگوں اور موٹروں کی طرف ایک عرصے سے دیکھ رہی تھی۔ دفعتہً اسے شنکر نظر آیا۔ مکان کے نیچے پہنچ کر اس نے گردن اونچی کی اور سلطانہ کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ سلطانہ نے غیر ارادی طور پر ہاتھ کا اشارہ کیا اور اسے اوپر بلا لیا۔

جب شنکر اوپر آگیا تو سلطانہ بہت پریشان ہوئی کہ اس سے کیا کہے۔ دراصل اس نے ایسے ہی بلا سوچے سمجھے اسے اشارہ کر دیا تھا۔ شنکر بے حد مطمئن تھا جیسے یہ اس کا اپنا گھر ہے۔ چنانچہ بڑی بے تکلفی سے پہلے روز کی طرح وہ گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔

جب سلطانہ نے دیر تک اس سے کوئی بات نہ کی تو اس نے کہا: "تم مجھے سو دفعہ بلا سکتی ہو اور سو دفعہ ہی کہہ سکتی ہو کہ چلے جاؤ۔ ۔ ۔ میں ایسی باتوں پر کبھی ناراض نہیں ہوا کرتا۔"

سلطانہ شش و پنج میں گرفتار ہو گئی۔ کہنے لگی: "نہیں بیٹھو، تمھیں جانے کو کون کہتا ہے۔ ۔ ۔"

شنکر اس پر مسکرا دیا: "تو میری شرطیں تمھیں منظور ہیں۔"

"کیسی شرطیں؟" سلطانہ نے ہنس کر کہا: "کیا نکاح کر رہے ہو مجھ سے؟"

"نکاح اور شادی کیسی؟ تم عمر بھر کسی سے نکاح کرو گی نہیں۔ یہ رسمیں ہم لوگوں کے لیے نہیں۔ ۔ چھوڑو ان فضولیات کو، کوئی کام کی بات کرو۔ ۔ ۔"

"بولو، کیا بات کروں؟"

"تم عورت ہو۔ ۔ کوئی ایسی بات شروع کرو جس سے دو گھڑی دل بہل جائے۔ اس دُنیا میں صرف دوکانداری ہی دوکانداری نہیں، کچھ اور بھی ہے۔ ۔ ۔"

سلطانہ ذہنی طور پر اب شنکر کو قبول کر چکی تھی۔ کہنے لگی: "صاف صاف کہو، تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔ ۔"

"جو دوسرے چاہتے ہیں۔" شنکر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"تم میں اور دوسروں میں پھر فرق ہی کیا رہا۔ ۔ ۔"

"تم میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں۔ ان میں اور مجھ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایسی بہت سی باتیں ہوتی ہیں جو پوچھنا نہیں چاہئیں، خود سمجھنا چاہئیں۔ ۔ ۔"

سلطانہ نے تھوڑی دیر تک شنکر کی اس بات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ پھر کہا: "میں سمجھ گئی۔ ۔ ۔"

"تو کہو، کیا ارادہ ہے۔ ۔ ۔"

"تم جیتے، میں ہاری۔ پر میں کہتی ہوں، آج تک کسی نے ایسی بات قبول نہ کی ہوگی۔"

"تم غلط کہتی ہو۔ ۔ اسی محلے میں تمھیں ایسی سادہ لوح عورتیں بھی مل جائیں گی جو کبھی یقین نہیں کریں گی کہ عورت ایسی ذلت قبول کر سکتی ہے جو تم بغیر کسی احساس کے قبول کرتی رہی ہو۔ لیکن ان کے نہ یقین کرنے کے باوجود تم ہزاروں کی تعداد میں موجود ہو۔ ۔ تمھارا نام سلطانہ ہے نا؟"

"سلطانہ ہی ہے۔ ۔ ۔!"

شنکر اُٹھ کھڑا ہوا اور ہنسنے لگا: "میرا نام شنکر ہے۔ ۔ ۔ یہ نام بھی عجب اوٹ پٹانگ ہوتے ہیں۔ چلو آؤ، اندر چلیں۔ ۔ ۔"

شنکر اور سلطانہ دری والے کمرے میں واپس آئے تو دونوں ہنس رہے تھے، نہ جانے کس بات پر۔ جب شنکر جانے لگا تو سلطانہ نے کہا: "شنکر، میری ایک بات مانو گے؟"

شنکر نے جواباً کہا: "پہلے بات بتاؤ۔"

سلطانہ کچھ جھینپ سی گئی: "تم کہو گے کہ میں دام وصول کرنا چاہتی ہوں مگر۔ ۔ ۔"

"کہو کہو۔ ۔ ۔ رک کیوں گئی ہو۔"

سلطانہ نے جرأت سے کام لے کر کہا: "بات یہ ہے کہ محرم آرہا ہے اور میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ میں کالی شلوار بنوا سکوں۔ ۔ ۔ یہاں کے سارے دُکھڑے تو تم مجھ سے سُن ہی چکے ہو۔ قمیص اور دوپٹہ میرے پاس موجود تھا جو میں نے آج رنگوانے کے لیے دے دیا ہے۔ ۔ ۔"

شنکر نے یہ سُن کر کہا: "تم چاہتی ہو کہ میں تمھیں کچھ روپے دے دوں جو تم کالی شلوار بنوا سکو۔"

سلطانہ نے فوراً ہی کہا: "نہیں، میرا مطلب یہ ہے کہ اگر ہو سکے تو تم مجھے ایک کالی شلوار لا دو۔"

شنکر مسکرایا: ”میری جیب میں تو اتفاق ہی سے کبھی کچھ ہوتا ہے۔ بہرحال میں کوشش کروں گا۔ محرم کی پہلی تاریخ کو تمہیں یہ شلوار مل جائے گی . . . . لو بس اب خوش ہو گئیں!“ پھر سلطانہ کے بندوں کی طرف دیکھ کر اس نے پوچھا: ”کیا یہ بندے تم مجھے دے سکتی ہو؟“

سلطانہ نے ہنس کر کہا: ”تم ان کا کیا کرو گے۔ چاندی کے معمولی بندے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ پانچ روپے کے ہوں گے۔“

اس پر شنکر نے کہا: ”میں نے تم سے بندے مانگے ہیں، ان کی قیمت نہیں پوچھی۔ بولو دیتی ہو . . “

”لے لو . . “ یہ کہہ کر سلطانہ نے بندے اتار کر شنکر کو دے دیے۔ پھر اسے افسوس ہوا مگر شنکر جا چکا تھا۔

سلطانہ کو قطعاً یقین نہیں تھا کہ شنکر اپنا وعدہ پورا کرے گا مگر آٹھ روز کے بعد محرم کی پہلی تاریخ کو صبح نو بجے دروازے پر دستک ہوئی۔ سلطانہ نے دروازہ کھولا تو شنکر کھڑا تھا۔ اخبار میں لپٹی ہوئی چیز اس نے سلطانہ کو دی اور کہا: ”ساٹن کی کالی شلوار ہے . . . دیکھ لینا شاید لمبی ہو . . . اب میں چلتا ہوں . . “

شنکر شلوار دے کر چلا گیا اور کوئی بات اس نے سلطانہ سے نہ کی۔ اس کی پتلون میں شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی سو کر اٹھا ہے اور سیدھا ادھر ہی چلا آیا ہے۔

سلطانہ نے کاغذ کھولا۔ ساٹن کی کالی شلوار تھی۔ ویسی ہی جیسی کہ وہ مختار کے پاس دیکھ کر آئی تھی۔ سلطانہ بہت خوش ہوئی۔ بندوں اور اس سودے کا جو افسوس اسے ہوا تھا، اس شلوار نے اور شنکر کی وعدہ ایفائی نے دور کر دیا۔

دوپہر کو وہ نیچے لانڈری والے سے اپنی رنگی ہوئی قمیص اور دوپٹہ لے آئی۔ تینوں کالے کپڑے جب اس نے پہن لیے تو دروازے پر دستک ہوئی۔

سلطانہ نے دروازہ کھولا تو مختار اندر داخل ہوئی۔ اس نے سلطانہ کے تینوں کپڑوں کی طرف دیکھا اور کہا ”قمیص اور دوپٹہ تو رنگا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ پر یہ شلوار نئی ہے . . . کب بنوائی؟“

سلطانہ نے جواب دیا: ”آج ہی درزی لایا ہے . . “ یہ کہتے ہوئے اس کی نظریں مختار کے کانوں پر پڑیں: ”یہ بندے تم نے کہاں سے لیے؟“

مختار نے جواب دیا: ”آج ہی منگوائے ہیں . . “

اس کے بعد دونوں کو تھوڑی دیر خاموش رہنا پڑا۔

دھواں

وہ جب اسکول روانہ ہوا تو اس نے راستے میں ایک قصائی دیکھا جس کے سر پر ایک بہت بڑا ٹوکرا تھا۔ اس میں دو تازہ ذبح کیے ہوئے بکرے تھے۔ ان کی کھالیں اُتری ہوئی تھیں اور ان کے ننگے گوشت میں سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ جگہ جگہ پر یہ گوشت جس کو دیکھ کر مسعود کے ٹھنڈے گالوں پر گرمی کی لہریں سی دوڑ جاتی تھیں، پھڑک رہا تھا جیسے کبھی کبھی اس کی آنکھ پھڑکا کرتی تھی۔

سوا نو بجے ہوں گے مگر جھکے ہوئے خاکستری بادلوں کے باعث ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت سویرا ہے۔ سردی میں شدت نہیں تھی لیکن راہ چلتے آدمیوں کے مُنہ سے گرم گرم سماوار کی ٹونٹیوں کی طرح گاڑھا سفید دھواں نکل رہا تھا۔ ہر شے بوجھل دکھائی دیتی تھی جیسے بادلوں کے وزن کے نیچے دبی ہوئی ہے۔ موسم کچھ ویسی ہی کیفیت کا حامل تھا جو ربڑ کے جوتے پہن کر چلنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے باوجود کہ بازار میں لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی اور دکانوں میں زندگی کے آثار پیدا ہو چکے تھے۔ آوازیں مدھم تھیں جیسے سرگوشیاں ہو رہی ہیں، چپکے چپکے دھیرے دھیرے باتیں ہو رہی ہیں، ہولے ہولے لوگ قدم اُٹھا رہے ہیں کہ زیادہ اونچی آواز پیدا نہ ہو۔

مسعود بغل میں بستہ دبائے اسکول جا رہا تھا۔ اس کی چال بھی سُست تھی۔ جب اس نے بے کھال

کے تازہ ذبح کیے ہوئے بکروں کے گوشت سے سفید سفید دھواں اُٹھتا دیکھا تو اسے راحت محسوس ہوئی۔ اس دھوئیں نے اس کے ٹھنڈے گالوں پر گرم گرم لکیروں کا ایک جال سا بُن دیا۔ اس گرمی نے اسے راحت پہنچائی اور وہ سوچنے لگا کہ سردیوں میں ٹھنڈے یخ ہاتھوں پر پسید کھانے کے بعد اگر یہ دھواں مل جایا کرے تو کتنا اچھا ہو۔

فضا میں اُجلاپن نہیں تھا۔ روشنی تھی مگر دھندلی۔ کہر کی ایک پتلی سی تہہ ہر شے پر چڑھی ہوئی تھی جس سے فضا میں گدلاپن پیدا ہو گیا تھا۔ یہ گدلاپن آنکھوں کو اچھا معلوم ہوتا تھا، اس لیے کہ نظر آنے والی چیزوں کی نوک پلک کچھ مدھم پڑ گئی تھی۔

مسعود جب اسکول پہنچا تو اسے اپنے ساتھیوں سے یہ معلوم کر کے قطعی طور پر خوشی نہ ہوئی کہ اسکول سکتر صاحب کی موت کے باعث بند کر دیا گیا ہے۔ سب لڑکے خوش تھے جس کا ثبوت یہ تھا کہ وہ اپنے بستے ایک جگہ پر رکھ کر اسکول کے صحن میں اوٹ پٹانگ کھیلوں میں مشغول تھے۔ کچھ چھٹی کا پتہ معلوم کرتے ہی گھر چلے گئے تھے۔ کچھ آرہے تھے اور کچھ نوٹس بورڈ کے پاس جمع تھے اور بار بار ایک ہی عبارت پڑھ رہے تھے۔

مسعود نے جب سُنا کہ سکتر صاحب مر گئے ہیں تو اسے بالکل افسوس ہوا۔ اس کا دل جذبات سے بالکل خالی تھا۔ اس نے یہ ضرور سوچا کہ پچھلے برس جب اس کے دادا جان کا انتقال ان ہی دنوں میں ہوا تھا تو ان کا جنازہ لے جانے میں بڑی دقت ہوئی تھی، اس لیے کہ بارش شروع ہو گئی تھی۔ وہ بھی جنازے کے ساتھ گیا تھا اور قبرستان میں چکنی کیچڑ کے باعث ایسا پھسلا تھا کہ کھدی ہوئی قبر میں گرتے گرتے بچا تھا۔ یہ سب باتیں اس کو اچھی طرح یاد تھیں۔ سردی کی شدت، اس کے کیچڑ سے لت پت کپڑے، سُرخی مائل نیلے ہاتھ جن کو دبانے سے سفید سفید دھبے پڑ جاتے تھے، ناک جو کہ برف کی ڈلی معلوم ہوتی تھی اور پھر آ کر ہاتھ پاؤں دھونے اور کپڑے بدلنے کا مرحلہ —— یہ سب کچھ اس کو اچھی طرح یاد تھا۔ چنانچہ جب اس نے سکتر صاحب کی موت کی خبر سُنی تو اسے بیتی ہوئی باتیں یاد آگئیں اور اس نے سوچا: جب سکتر صاحب کا جنازہ اُٹھے گا تو بارش شروع ہو جائے گی اور قبرستان میں اتنی کیچڑ ہو جائے گی کہ کئی لوگ پھسلیں گے اور ان کو ایسی چوٹیں آئیں گی کہ وہ بلبلا اُٹھیں گے۔

مسعود نے یہ خبر سُن کر سیدھا اپنی کلاس کا رُخ کیا۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے اپنے ڈیسک کا تالا کھولا۔ دو تین کتابیں جو کہ اسے دوسرے روز پھر لانا تھیں، رکھیں اور باقی بستہ اُٹھا کر گھر کی جانب چل پڑا۔

راستے میں اس نے پھر وہی دو تازہ ذبح کیے ہوئے بکرے دیکھے۔ ان میں سے ایک کو اب قصائی نے لٹکا دیا تھا۔ دوسرا تختے پر پڑا تھا۔ جب مسعود دکان پر سے گزرا تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ گوشت کو جس میں سے دھواں اُٹھ رہا تھا، چھو کر دیکھے۔ چنانچہ اس نے آگے بڑھ کر انگلی سے بکرے کے اس حصے کو چھو کر دیکھا جو ابھی تک پھڑک رہا تھا۔ گوشت گرم تھا۔ مسعود کی ٹھنڈی انگلی کو یہ حرارت بہت بھلی معلوم ہوئی۔ قصائی دکان کے اندر چھریاں تیز کرنے میں معروف تھا۔ چنانچہ مسعود نے ایک بار پھر گوشت کو چھو کر دیکھا اور وہاں سے چل پڑا۔

گھر پہنچ کر اس نے جب اپنی ماں کو سکتر صاحب کی موت کی خبر سنائی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کے ابا جی انہی کے جنازے کے ساتھ گئے ہیں۔ اب گھر میں صرف دو آدمی تھے۔ ماں اور بڑی بہن۔ ماں باورچی خانہ میں بیٹھی سالن پکا رہی تھی اور بڑی بہن کلثوم پاس ہی ایک کانگڑی لیے درباری کی سرگم یاد کر رہی تھی۔

چونکہ گلی کے دوسرے لڑکے گورنمنٹ اسکول میں پڑھتے تھے جس پر اسلامیہ اسکول کے سکتر کی موت

کا کچھ اثر نہیں ہوا تھا۔ اس لیے مسعود نے خود کو بالکل بیکار محسوس کیا۔ اسکول کا کوئی کام بھی نہیں تھا۔ چھٹی جماعت میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے۔ وہ گھر میں اپنے آبا جی سے پڑھ چکا تھا۔ کھیلنے کے لیے بھی اس کے پاس کوئی چیز نہ تھی۔ ایک میلا کچیلا تاش طاق میں پڑا تھا مگر اس سے مسعود کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ لوڈو اور اسی قسم کے دوسرے کھیل جو اس کی بڑی بہن اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہر روز کھیلتی تھی۔ اس کی سمجھ سے بالاتر تھے۔ سمجھ سے بالاتر یوں تھے کہ مسعود نے کبھی ان کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ اس کو فطرتاً ایسے کھیلوں سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔

بستہ اپنی جگہ پر رکھنے اور کوٹ اتارنے کے بعد وہ باورچی خانے میں اپنی ماں کے پاس بیٹھ گیا اور درباری کی سرگم سنتا رہا جس میں کئی دفعہ سارے گاما آتا تھا۔ اس کی ماں پالک کاٹ رہی تھی۔ پالک کاٹنے کے بعد اس نے سبز سبز پتوں کا گیلا گیلا ڈھیر اٹھا کر ہنڈیا میں ڈال دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب پالک کو آنچ لگی تو اس میں سے سفید سفید دھواں اٹھنے لگا۔ اس دھوئیں کو دیکھ کر مسعود کو بکرے کا گوشت یاد آ گیا۔ چنانچہ اس نے اپنی ماں سے کہا: "امی جان، آج میں نے قصائی کی دکان پر دو بکرے دیکھے۔ ان کی کھال اتری ہوئی تھی اور ان میں سے دھواں نکل رہا تھا، بالکل ویسے ہی جیسا کہ صبح سویرے میرے منہ سے نکلا کرتا ہے۔"

"اچھا . . . !" یہ کہہ کر اس کی ماں چولھے میں لکڑیوں کے کوئلے جھاڑنے لگی۔

"ہاں . . . اور میں نے گوشت کو اپنی انگلی سے چھو کر دیکھا تو وہ گرم تھا۔"

"اچھا . . . !" یہ کہہ کر اس کی ماں نے وہ برتن اٹھایا جس میں اس نے پالک کا ساگ دھویا تھا اور باورچی خانے سے باہر چلی گئی۔

". . . اور یہ گوشت کئی جگہ پر پھڑک بھی رہا تھا۔"

"اچھا . . . " مسعود کی بڑی بہن نے درباری کی سرگم یاد کرنا چھوڑ دی اور اس کی طرف متوجہ ہوئی: "کیسے پھڑکتا تھا؟"

"یوں . . . یوں" مسعود نے انگلیوں سے پھڑکن پیدا کر کے اپنی بہن کو دکھائی۔

"پھر کیا ہوا؟" یہ سوال کلثوم نے اپنے سرگم بھرے دماغ سے کچھ اس طور پر نکالا کہ مسعود ایک لحظے کے لیے بالکل خالی الذہن ہو گیا۔

"پھر کیا ہونا تھا۔ میں نے ایسے ہی آپ سے بات کی تھی کہ قصائی کی دکان پر گوشت پھڑک رہا تھا۔ میں نے انگلی سے چھو کر بھی دیکھا تھا۔ گرم تھا۔"

"گرم تھا . . . ! اچھا مسعود یہ بتاؤ، تم میرا ایک کام کرو گے۔"

"بتائیے۔"

"آؤ، میرے ساتھ آؤ۔"

"نہیں آپ پہلے بتائیے۔ کام کیا ہے۔"

"تم آؤ تو سہی میرے ساتھ۔"

"جی نہیں . . . آپ پہلے کام بتائیے۔"

"دیکھو میری کمر میں بڑا درد ہو رہا ہے . . . میں پلنگ پر لیٹتی ہوں، تم ذرا پاؤں سے دبا دینا . . . اچھے بھائی جو ہوئے۔ اللہ کی قسم، بڑا درد ہو رہا ہے۔" یہ کہہ کر مسعود کی بہن نے اپنی کمر پر مکیاں مارنا شروع

کردیں۔

”یہ آپ کی کمر کو کیا ہو جاتا ہے۔ جب دیکھو، درد ہو رہا ہے، اور پھر آپ دبواتی بھی مجھی سے ہیں۔ کیوں نہیں اپنی سہیلیوں سے کہتیں۔ . . .“ مسعود اٹھ کھڑا ہوا اور راضی ہو گیا: ”چلیے، لیکن آپ سے یہ کہے دیتا ہوں کہ دس منٹ سے زیادہ میں بالکل نہیں دباؤں گا۔ . . .“

”شاباش، شاباش۔“ اس کی بہن اٹھ کھڑی ہوئی اور سرگموں کی کاپی سامنے طاق میں رکھ کر اس کمرے کی طرف روانہ ہوئی جہاں وہ اور مسعود، دونوں سوتے تھے۔

صحن میں پہنچ کر اس نے اپنی دکھتی ہوئی کمر سیدھی کی اور اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ مٹیالے بادل جھکے ہوئے تھے: ”مسعود آج ضرور بارش ہوگی۔“ یہ کہہ کر اس نے مسعود کی طرف دیکھا مگر وہ اندر اپنی چارپائی پر لیٹا تھا۔

جب کلثوم اپنے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹ گئی تو مسعود نے اٹھ کر گھڑی میں وقت دیکھا: ”دیکھیے باجی، گیارہ بجنے میں دس منٹ باقی ہیں۔ میں پورے گیارہ بجے آپ کی کمر دابنا چھوڑ دوں گا۔“

”بہت اچھا، لیکن تم اب خدا کے لیے زیادہ نخرے نہ بگھارو۔ ادھر میرے پلنگ پر آکر جلدی کمر دباؤ، ورنہ یاد رکھو، بڑے زور سے کان اینٹھوں گی۔“ کلثوم نے مسعود کو ڈانٹ پلائی۔

مسعود نے اپنی بڑی بہن کے حکم کی تعمیل کی اور دیوار کا سہارا لے کر پاؤں سے اس کی کمر دبانا شروع کر دی۔ مسعود کے وزن کے نیچے کلثوم کی چوڑی چکلی کمر میں خفیف سا جھکاؤ پیدا ہو گیا۔ جب اس نے پیروں سے دبانا شروع کیا، ٹھیک اسی طرح جس طرح مزدور مٹی گوندھتے ہیں تو کلثوم نے مزا لینے کی خاطر ہولے ہولے ہائے ہائے کرنا شروع کر دیا۔

کلثوم کے کولھوں پر گوشت زیادہ تھا۔ جب مسعود کا پاؤں اس حصے پر پڑا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ اس بکرے کے گوشت کو دبا رہا ہے جو اس نے قصائی کی دکان میں اپنی انگلی سے چھو کر دیکھا تھا۔ اس احساس نے چند لمحات کے لیے اس کے دل و دماغ میں ایسے خیالات پیدا کیے جن کا کوئی سر تھا نہ پیر۔ وہ ان کا مطلب نہ سمجھ سکا اور سمجھتا بھی کیسے جبکہ کوئی خیال مکمل ہی نہ تھا۔

ایک دو بار مسعود نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کے پیروں کے نیچے گوشت کے لوتھڑوں میں حرکت پیدا ہوئی ہے، اسی قسم کی حرکت جو اس نے بکرے کے گرم گرم گوشت میں دیکھی تھی —— اس نے بڑی بددلی سے کمر دبانا شروع کی تھی مگر اب اسے اس کام میں لذت محسوس ہونے لگی۔ اس کے وزن کے نیچے کلثوم ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔ یہ بھینچی بھینچی آواز جو کہ مسعود کے پیروں کی حرکت کا ساتھ دے رہی تھی، اس گمنام سی لذت میں اضافہ کر رہی تھی۔

ٹائم پیس میں گیارہ بج گئے مگر مسعود اپنی بہن کلثوم کی کمر دباتا رہا۔ جب کمر اچھی طرح دبائی جا چکی تو کلثوم سیدھی لیٹ گئی اور کہنے لگی: ”شاباش مسعود، شاباش۔ لو اب لگے ہاتھوں ٹانگیں بھی دبا دو، بالکل اسی طرح . . . شاباش میرے بھائی . . .“

مسعود نے دیوار کا سہارا لے کر کلثوم کی رانوں پر جب اپنا پورا وزن ڈالا تو اس کے پاؤں کے نیچے مچھلیاں تڑپ سی گئیں —— بے اختیار وہ ہنس پڑی اور دوہری ہو گئی۔

مسعود گرتے گرتے بچا لیکن اس کے تلووں میں مچھلیوں کی وہ تڑپ منجمد سی ہو گئی۔ اس کے دل میں زبردست خواہش پیدا ہوئی کہ وہ پھر اسی طرح دیوار کا سہارا لے کر اپنی بہن کی رانیں دبائے۔ چنانچہ اس نے کہا: ”یہ آپ

نے ہنسنا کیوں شروع کردیا۔ سیدھی لیٹ جائیے کہ میں آپ کی ٹانگیں دبا دوں۔ ۔ ۔ "

کلثوم سیدھی لیٹ گئی۔ رانوں کی مچھلیاں اِدھر اُدھر ہونے کے باعث جو گدگدی پیدا ہوئی تھی، اس کا اثر ابھی تک اس کے جسم میں باقی تھا: " نا بھائی، میرے گدگدی ہوتی ہے۔ تم وحشیوں کی طرح دباتے ہو۔ ۔ "

مسعود نے خیال کیا کہ شاید اس نے غلط طریقہ استعمال کیا ہے: " نہیں، اب کی دفعہ میں پورا بوجھ آپ پر نہیں ڈالوں گا۔ ۔ آپ اطمینان رکھیے، اب ایسی اچھی طرح دباؤں گا کہ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ ۔ "

دیوار کا سہارا لے کر مسعود نے اپنے جسم کو تولا اور اس انداز سے آہستہ آہستہ کلثوم کی رانوں پر اپنے پیر جمائے کہ اس کا آدھا بوجھ کہیں غائب ہوگیا۔ ہولے ہولے بڑی ہوشیاری سے اس نے پیر چلانے شروع کیے۔ کلثوم کی رانوں میں اکڑی ہوئی مچھلیاں اس کے پیروں کے نیچے دب دب کر ادھر اُدھر پھسلنے لگیں ——— مسعود نے ایک بار اسکول میں تنے ہوئے رسّے پر ایک بازیگر کو چلتے دیکھا تھا۔ اس نے سوچا کہ بازیگر کے پیروں کے نیچے تنا ہوا رسا اسی طرح پھسلتا ہوگا۔

اس سے پہلے کئی بار اس نے اپنی بہن کلثوم کی ٹانگیں دبائی تھیں مگر وہ لذت جو کہ اسے اب محسوس ہو رہی تھی، پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ بکرے کے گرم گرم گوشت کا اسے بار بار خیال آتا تھا۔ ایک دو مرتبہ اس نے سوچا: " کلثوم کو اگر ذبح کیا جائے تو کھال اُتر جانے پر کیا اس کے گوشت میں سے بھی دھواں نکلے گا؟ " لیکن ایسی بیہودہ باتیں سوچنے پر اس نے اپنے آپ کو مجرم محسوس کیا اور دماغ کو اس طرح صاف کردیا جیسے وہ سلیٹ کو اسفنج سے صاف کیا کرتا تھا۔

" بس، بس "! کلثوم تھک گئی: " بس بس۔ ۔ ۔ "

مسعود کو ایک گھم شرارت سوجھی۔ وہ پلنگ پر سے نیچے اُترنے لگا تو اس نے کلثوم کی دونوں بغلوں میں گدگدی شروع کردی۔ ہنسی کے مارے وہ لوٹ پوٹ ہوگئی۔ اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ مسعود کے ہاتھوں کو پرے جھٹک دے لیکن جب اس نے ارادہ کرکے مسعود کے لات جمانی چاہی تو مسعود اُچھل کر زد سے باہر ہوگیا اور سلیپر پہن کر کمرے سے نکل گیا۔

جب وہ صحن میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی ہے۔ بادل اور بھی جھک آئے تھے۔ پانی کے ننھے ننھے قطرے آواز پیدا کیے بغیر صحن کی اینٹوں میں آہستہ آہستہ جذب ہو رہے تھے۔ مسعود کا جسم ایک دل نواز حرارت محسوس کر رہا تھا۔ جب ہوا کا ٹھنڈا ٹھنڈا جھونکا اس کے گالوں کے ساتھ مس ہوا اور دو تین ننھی ننھی بوندیں اس کی ناک پر پڑیں تو ایک جھرجھری سی اس کے بدن میں لہرا اُٹھی۔ سامنے کوٹھے کی دیوار پر ایک کبوتر اور ایک کبوتری پاس پاس پر پھلائے بیٹھے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونوں دم پخت کی ہوئی ہنڈیا کی طرح گرم ہیں۔ گل داؤدی اور نازبو کے ہرے ہرے پتے اوپر لال لال گملوں میں نہا رہے تھے۔ فضا میں نیندیں گھلی ہوئی تھیں۔ ایسی نیندیں جن میں بیداری زیادہ ہوتی ہے اور انسان کے اردگرد نرم نرم خوابیلوں لپیٹ جاتے ہیں جیسے اونی کپڑے۔

مسعود ایسی باتیں سوچنے لگا جن کا مطلب اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ وہ ان باتوں کو چھو کر دیکھ سکتا تھا مگر ان کا مطلب اس کی گرفت سے باہر تھا۔ پھر بھی ایک گمنام سا مزا اس سوچ بچار میں اسے آرہا تھا۔

بارش میں کچھ دیر کھڑے رہنے کے باعث جب مسعود کے ہاتھ بالکل یخ ہوگئے اور دبانے سے ان پر سفید

دھبے پڑنے لگے تو اس نے مٹھیاں کس لیں اور ان کو منہ کی بھاپ سے گرم کرنا شروع کیا۔ ہاتھوں کو اس عمل سے کچھ گرمی تو پہنچی مگر وہ نم آلود ہو گئے۔ چنانچہ آگ تاپنے کے لیے وہ باورچی خانے میں چلا گیا۔ کھانا تیار تھا۔ ابھی اس نے پہلا لقمہ ہی اٹھایا تھا کہ اس کا باپ قبرستان سے واپس آ گیا۔ باپ بیٹے میں کوئی بات نہ ہوئی۔ مسعود کی ماں اٹھ کر فوراً دوسرے کمرے میں چلی گئی اور وہاں دیر تک اپنے خاوند کے ساتھ باتیں کرتی رہی۔

کھانے سے فارغ ہو کر مسعود بیٹھک میں چلا گیا اور کھڑکی کھول کر فرش پر لیٹ گیا۔ بارش کی وجہ سے سردی کی شدت بڑھ گئی تھی کیونکہ اب ہوا بھی چل رہی تھی۔ مگر یہ سردی ناخوشگوار معلوم نہیں ہوتی تھی۔ تالاب کے پانی کی طرح یہ اوپر ٹھنڈی اور اندر گرم تھی۔ مسعود جب فرش پر لیٹا تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اس سردی کے اندر دھنس جائے جہاں اس کے جسم کو راحت انگیز گرمی پہنچے۔ دیر تک وہ ایسی ہی شیر گرم باتوں کے متعلق سوچتا رہا جس کے باعث اس کے پٹھوں میں ہلکی ہلکی دکھن پیدا ہو گئی۔ ایک دو بار اس نے انگڑائی لی تو اسے مزہ آیا۔ اس کے جسم کے کسی حصے میں، یہ اس کو معلوم نہیں تھا کہ کہاں، کوئی چیز اٹک سی گئی تھی۔ یہ چیز کیا تھی، اس کے متعلق بھی مسعود کو علم نہیں تھا البتہ اس اٹکاؤ نے اس کے سارے جسم میں اضطراب، ایک دبے ہوئے اضطراب کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اس کا سارا جسم کھنچ کر لمبا ہو جانے کا ارادہ بن گیا تھا۔

دیر تک گدگدے قالین پر کروٹیں بدلنے کے بعد وہ اٹھا اور باورچی خانے سے ہوتا ہوا صحن میں آ نکلا۔ کوئی باورچی خانے میں تھا نہ صحن میں۔ ادھر ادھر جتنے کمرے تھے، سب کے سب بند تھے۔ بارش اب رک گئی تھی۔ مسعود نے ہاکی اور گیند نکالی اور صحن میں کھیلنا شروع کر دیا۔ ایک بار جب اس نے زور سے ہٹ لگائی تو گیند صحن کے دائیں ہاتھ والے کمرے کے دروازے پر لگی۔ اندر سے مسعود کے باپ کی آواز آئی: "کون ہے؟"

"جی میں ہوں مسعود!"

اندر سے آواز آئی: "کیا کر رہے ہو؟"

"جی کھیل رہا ہوں!"

"کھیلو۔ . . " پھر تھوڑے سے توقف کے بعد اس کے باپ نے کہا: "تمہاری ماں میرا سر دبا رہی ہے، زیادہ شور نہ مچانا۔ . . "

یہ سن کر مسعود نے گیند وہیں پڑی رہنے دی اور ہاکی ہاتھ میں لیے سامنے والے کمرے کا رخ کیا۔ اس کا ایک دروازہ بند تھا اور دوسرا نیم باز —— مسعود کو ایک شرارت سوجھی۔ دبے پاؤں وہ نیم باز دروازے کی طرف بڑھا اور دھماکے کے ساتھ اس نے دونوں پٹ کھول دیے۔ دو چیخیں بلند ہوئیں اور کلثوم اور اس کی سہیلی بملا نے جو کہ پاس پاس لیٹی تھیں، خوفزدہ ہو کر جھٹ سے لحاف اوڑھ لیا۔

بملا کے بلاؤز کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور کلثوم اس کے عریاں سینے کو گھور رہی تھی۔

مسعود کچھ سمجھ نہ سکا۔ اس کے دماغ پر دھواں سا چھا گیا۔ وہاں سے الٹے قدم لوٹ کر وہ جب بیٹھک کی طرف روانہ ہوا تو اسے معاً اپنے اندر ایک اتھاہ طاقت کا احساس ہوا جس نے کچھ دیر کے لیے اس کی سوچنے سمجھنے کی قوت بالکل کمزور کر دی۔

بیٹھک میں کھڑکی کے پاس بیٹھ کر جب مسعود نے ہاکی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر گھٹنے پر رکھا تو یہ سوچا کہ ہلکا سا دباؤ ڈالنے پر بھی ہاکی میں خم پیدا ہو جائے گا اور زیادہ زور لگانے پر تو ہینڈل چٹاخ سے ٹوٹ

جائے گا——— اس نے گھٹنے پر ہاکی کے ہینڈل میں خم تو پیدا کر لیا مگر زیادہ سے زیادہ زور لگانے پر بھی وہ ٹوٹ نہ سکا۔ دیر تک وہ ہاکی کے ساتھ کشتی لڑتا رہا۔ جب وہ تھک کر ہار گیا تو جھنجلا کر اس نے ہاکی پرے پھینک دی۔

نو

برسات کے یہی دن تھے۔ کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے اسی طرح نہا رہے تھے۔ ساگوان کے اس اسپرنگوں والے پلنگ پر جو اب کھڑکی کے پاس سے ذرا ادھر کو سرکا دیا گیا تھا، ایک گھاٹن لونڈیا زندھیر کے ساتھ چمٹی ہوئی تھی۔

کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے رات کے دودھیالے اندھیرے میں جھمکوں کی طرح تھرتھرا رہے تھے اور نہا رہے تھے اور وہ گھاٹن لونڈیا زندھیر کے ساتھ کپکپاہٹ بن کر چمٹی ہوئی تھی۔

شام کے قریب، دن بھر ایک انگریزی اخبار کی تمام خبریں اور اشتہار پڑھنے کے بعد جب وہ بالکنی میں ذرا تفریح کی خاطر آکھڑا ہوا تھا تو اس نے اس گھاٹن لڑکی کو جو غالباً ساتھ والے رسیوں کے کارخانے میں کام کرتی تھی اور بارش سے بچنے کے لیے املی کے درخت کے نیچے کھڑی تھی، کھانس کھنکار کر اپنی طرف متوجہ کیا تھا اور آخر میں ہاتھ کے اشارے سے اسے اوپر بلا لیا تھا۔

وہ کئی دنوں سے شدید قسم کی تنہائی محسوس کر رہا تھا۔ جنگ کے باعث بمبئی کی قریب قریب تمام کرسچین چھوکریاں جو پہلے سستے داموں پر مل جاتی تھیں، عورتوں کی اگزالری فورس میں بھرتی ہو گئی تھیں۔ ان میں سے بعض

نے فورٹ کے علاقے میں ڈانسنگ اسکول کھول لیے تھے جہاں صرف فوجی گوروں کو جانے کی اجازت تھی ——

رندھیر بہت اداس ہوگیا تھا۔ اس کی اداسی کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ کرسچین چھوکریاں نایاب ہوگئی تھیں، دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ رندھیر جو فوجی گوروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ مہذب، تعلیم یافتہ، صحت مند اور خوبصورت تھا، صرف اس لیے اس پر فورٹ کے اکثر قحبہ خانوں کے دروازے بند کر دیے گئے تھے کہ اس کی چمڑی سفید نہیں تھی۔

جنگ سے پہلے رندھیر ناگپاڑہ اور تاج ہوٹل کے گرد و نواح کی کئی کرسچین لڑکیوں سے جسمانی ملاقات کر چکا تھا۔ سے اچھی طرح معلوم تھا کہ ایسی ملاقات کے آداب سے وہ ان کرسچین لونڈوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ واقفیت رکھتا ہے جن سے یہ لڑکیاں فیشن کے طور پر رومانس لڑاتی ہیں اور بعد میں کسی چغد سے شادی کر لیتی ہیں۔

رندھیر نے محض دل ہی دل میں ہیزل سے اس کی تازہ تازہ پیدا شدہ رعونت کا بدلہ لینے کی خاطر اس گھاٹن لڑکی کو اشارے سے اوپر بلایا تھا۔ ہیزل اس کے فلیٹ کے نیچے رہتی تھی اور ہر روز صبح کو وردی پہن کر اور اپنے کٹے ہوئے بالوں پر خاکی رنگ کی ٹوپی ترچھے زاویے پر جما کر باہر نکلتی تھی اور اس انداز سے چلتی تھی گویا فٹ پاتھ پر تمام جانے والے اس کے قدموں کے آگے ٹاٹ کی طرح بچھتے چلے جائیں گے۔

رندھیر نے سوچا تھا کہ آخر وہ کیوں ان کرسچین چھوکریوں کی طرف اتنا راغب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے جسم کی تمام قابلِ نمائش چیزوں کی اچھی طرح نمائش کرتی ہیں۔ کسی قسم کی جھجک محسوس کیے بغیر اپنے ایام کی بے ترتیبی کا ذکر کر دیتی ہیں۔ اپنے پرانے معاشقوں کا حال سناتی ہیں۔ جب ڈانس کی دھن سنتی ہیں تو اپنی ٹانگیں تھرکانا شروع کر دیتی ہیں —— یہ سب ٹھیک ہے لیکن کوئی عورت بھی ان تمام خوبیوں کی حامل ہو سکتی ہے۔

رندھیر نے جب گھاٹن لڑکی کو اشارے سے اوپر بلایا تھا تو اسے ہرگز ہرگز یقین نہیں تھا کہ وہ اس کو اپنے ساتھ سلا سکے گا لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد جب اس نے اس کے بھیگے ہوئے کپڑے دیکھ کر یہ خیال کیا تھا، کہیں ایسا نہ ہو بیچاری کو نمونیہ ہو جائے تو رندھیر نے اس سے کہا تھا کہ: "یہ کپڑے اتار دو، سردی لگ جائے گی۔ ۔ ۔"

وہ اس کا مطلب سمجھ گئی تھی کیونکہ اس کی آنکھوں میں شرم کے لال ڈورے تیر گئے تھے مگر بعد میں جب رندھیر نے اسے اپنی سفید دھوتی نکال کر دی تو اس نے کچھ دیر سوچ کر اپنا کاشٹا کھولا جس کا میل بھیگنے کے باعث اور زیادہ ابھر آیا تھا —— کاشٹا کھول کر اس نے ایک طرف رکھ دیا اور جلدی سے سفید دھوتی اپنی رانوں پر ڈال لی۔ پھر اس نے اپنی پھنسی پھنسی چولی اتارنے کی کوشش شروع کی جس کے دونوں کناروں کو ملا کر اس نے ایک گانٹھ دے رکھی تھی۔ یہ گانٹھ اس کے تندرست سینے کے ننھے مگر میلے گڑھے میں جذب سی ہو گئی تھی۔

دیر تک وہ اپنے گھسے ہوئے ناخنوں کی مدد سے چولی کی گرہ کھولنے کی کوشش کرتی رہی جو بارش کے پانی سے بہت زیادہ مضبوط ہو گئی تھی۔ جب تھک ہار گئی تو اس نے مرہٹی زبان میں رندھیر سے کچھ کہا جس کا مطلب یہ تھا: "میں کیا کروں، نہیں کھلتی۔ ۔ ۔"

رندھیر اس کے پاس بیٹھ گیا اور گرہ کھولنے لگا۔ تھک ہار کر اس نے ایک ہاتھ میں چولی کا ایک سرا پکڑا، دوسرے ہاتھ میں دوسرا اور زور سے کھینچا۔ گرہ ایک دم پھسلی، رندھیر کے ہاتھ زور میں ادھر ادھر ہٹے اور دو دھڑکتی ہوئی چھاتیاں نمودار ہوئیں۔ رندھیر نے ایک لمحے کے لیے خیال کیا کہ اس کے اپنے ہاتھوں نے اس گھاٹن لڑکی کے سینے پر نرم نرم گندھی ہوئی مٹی کو چابکدست کمہار کی طرح دو پیالوں کی شکل دے دی ہے۔

اس کی صحت مند چھاتیوں میں وہی گدراہٹ، وہی جاذبیت، وہی طراوت، وہی گرم گرم ٹھنڈک تھی جو

کمہار کے ہاتھوں سے نکلے ہوئے تازہ تازہ کچے برتنوں میں ہوتی ہے۔

مٹیلے رنگ کی ان جوان چھاتیوں میں جو بالکل بے داغ تھیں، ایک عجیب قسم کی چمک محلول تھی۔ سیاہی مائل گندمی رنگ کے نیچے دھندلی روشنی کی ایک تہہ سی تھی جس نے یہ عجیب و غریب چمک پیدا کر دی تھی جو چمک ہونے کے باوجود چمک نہیں تھی۔ اس کے سینے پر چھاتیوں کے یہ اُبھار دیئے معلوم ہوتے تھے جو تالاب کے گدلے پانی کے اندر جل رہے ہوں۔

برسات کے یہی دن تھے۔ کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے کپکپا رہے تھے۔ اس گھاٹن لڑکی کے دونوں کپڑے جو پانی سے شرابور ہو چکے تھے، ایک غلیظ ڈھیری کی شکل میں فرش پر پڑے تھے اور وہ زندھیر کے ساتھ چمٹی ہوئی تھی۔ اس کے ننگے اور میلے بدن کی گرمی زندھیر کے جسم میں وہ کیفیت پیدا کر رہی تھی جو سخت سردیوں میں نائیوں کے غلیظ مگر گرم حمام میں نہاتے وقت محسوس ہوا کرتی ہے۔

ساری رات وہ زندھیر کے ساتھ چمٹی رہی۔ دونوں گویا ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے تھے۔ انھوں نے بمشکل ایک دو باتیں کی ہوں گی کیونکہ جو کچھ انھیں کہنا سننا تھا، سانسوں، ہونٹوں اور ہاتھوں سے طے ہوتا رہا تھا۔ زندھیر کے ہاتھ ساری رات اس کی چھاتیوں پر ہوائی لمس کی طرح پھرتے رہے۔ چھوٹی چھوٹی چوچیاں اور وہ موٹے موٹے مسام جو ان کے اردگرد ایک کالے دائرے کی شکل میں پھیلے ہوئے تھے، اس ہوائی لمس سے جاگ اُٹھتے اور اس گھاٹن لڑکی کے سارے جسم میں ایسا ارتعاش پیدا ہو جاتا کہ زندھیر خود بھی ایک لمحے کے لیے کپکپا اُٹھتا۔

ایسی کپکپاہٹوں سے زندھیر کا سینکڑوں مرتبہ تعارف ہو چکا تھا۔ وہ اس کی لذت سے اچھی طرح آشنا تھا۔ کئی لڑکیوں کے نرم اور سخت سینوں کے ساتھ اپنا سینہ ملا کر وہ ایسی راتیں گزار چکا تھا۔ وہ ایسی لڑکیوں کے ساتھ بھی رہ چکا تھا جو بالکل الھڑ تھیں اور اس کے ساتھ لپٹ کر گھر کی وہ تمام باتیں سُنا دیا کرتی تھیں جو کسی غیر کو نہیں سُنانا چاہئیں۔ وہ ایسی لڑکیوں سے بھی جسمانی رشتہ قائم کر چکا تھا جو ساری مشقت خود کرتی تھیں اور اسے کوئی تکلیف نہیں دیتی تھیں مگر یہ گھاٹن لڑکی جو املی کے درخت کے نیچے بھیگی ہوئی کھڑی تھی اور جس کو اس نے اشارے سے اوپر بلا لیا تھا، بہت ہی مختلف تھی۔

ساری رات زندھیر کو اس کے بدن سے عجیب و غریب قسم کی بُو آتی رہی تھی۔ اس بُو کو جو بیک وقت خوشبو اور بدبو تھی، وہ تمام رات پیتا رہا تھا۔ اس کی بغلوں سے، اس کی چھاتیوں سے، اس کے بالوں سے، اس کے پیٹ سے، ہر جگہ سے یہ بُو جو بدبُو بھی تھی اور خوشبو بھی، زندھیر کے ہر سانس میں موجود تھی۔ تمام رات وہ سوچتا رہا تھا کہ یہ گھاٹن لڑکی بالکل قریب ہونے پر بھی ہرگز ہرگز اتنی زیادہ قریب نہ ہوتی، اگر اس کے ننگے بدن سے یہ بُو نہ اُڑتی —— یہ بُو جو اس کے دل و دماغ کی ہر سلوٹ میں رینگ گئی تھی، اس کے تمام پرانے اور نئے خیالوں میں رچ گئی تھی۔

اس بُو نے اس لڑکی کو اور زندھیر کو ایک رات کے لیے آپس میں حل کر دیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے اندر داخل ہو گئے تھے، عمیق ترین گہرائیوں میں اتر گئے تھے جہاں پہنچ کر وہ ایک خالص انسانی لذت میں تبدیل ہو گئے تھے، ایسی لذت جو لمحاتی ہونے کے باوجود دائمی تھی، جو مائلِ پرواز ہونے کے باوجود ساکن اور جامد تھی —— وہ دونوں ایک ایسا پنچھی بن گئے تھے جو آسمان کی نیلاہٹوں میں اُڑتا اُڑتا غیر متحرک دکھائی دیتا ہے۔

بُو کو جو اس گھاٹن لڑکی کے ہر مسام سے باہر نکلی تھی، زندھیر اچھی طرح سمجھتا تھا حالانکہ وہ کا تجزیہ نہیں کر سکتا تھا طرح بعض اوقات مٹی پر پانی چھڑکنے سے سوندھی سوندھی باس پیدا ہوتی ہے، لیکن نہیں، وہ بُو کچھ

اور ہی قسم کی تھی۔ اس میں لونڈر اور عطر کا مصنوعی پن نہیں تھا۔ وہ بالکل اصلی تھی —— عورت اور مرد کے باہمی تعلقات کی طرح اصلی اور ازلی۔

رندھیر کو پسینے کی بُو سے سخت نفرت تھی۔ وہ نہانے کے بعد عام طور پر اپنی بغلوں وغیرہ میں خوشبودار پوڈر لگاتا تھا یا کوئی ایسی دوا استعمال کرتا تھا جس سے پسینے کی بُو دب جائے لیکن حیرت ہے کہ اس نے کئی بار، ہاں کئی بار اس گھاٹن لڑکی کی بالوں بھری بغلوں کو چوما اور اسے بالکل گھن نہ آئی بلکہ اسے عجیب طرح کی لذت محسوس ہوئی۔ اس کی بغلوں کے نرم نرم بال پسینے کے باعث گیلے ہو رہے تھے۔ ان سے بھی وہی بُو نکلی تھی جو غایت درجہ قابلِ فہم ہونے کے باوجود ناقابلِ فہم تھی۔ رندھیر کو ایسا لگا تھا کہ وہ اس بو کو جانتا ہے، پہچانتا ہے، اس کا مطلب بھی سمجھتا ہے لیکن کسی اور کو یہ مطلب سمجھا نہیں سکتا۔

برسات کے یہی دن تھے۔ . . اسی کھڑکی کے باہر جب اس نے دیکھا تھا تو پیپل کے پتے لرز لرز کر نہا رہے تھے، ہواؤں میں سرسراہٹیں اور پھڑپھڑاہٹیں گھلی ہوئی تھیں۔ اندھیرا تھا مگر اس میں دبی دبی دھندلی سی روشنی بھی سموئی ہوئی تھی جیسے بارش کے قطروں کے ساتھ لگ کر تاروں کی تھوڑی تھوڑی روشنی اتر آئی ہے —— برسات کے یہی دن تھے جب رندھیر کے اسی کمرے میں ساگوان کا صرف ایک پلنگ ہوتا تھا مگر اب اس کے ساتھ ہی ایک دوسرا بھی پڑا تھا اور کونے میں ایک نئی ڈریسنگ ٹیبل بھی موجود تھی۔ دن یہی برسات کے تھے، موسم بھی بالکل ایسا ہی تھا، بارش کے قطروں کے ساتھ تاروں کی تھوڑی تھوڑی روشنی بھی اتر رہی تھی مگر فضا میں حنا کے عطر کی تیز خوشبو بسی ہوئی تھی۔

دوسرا پلنگ خالی تھا۔ اس پلنگ پر جس پر رندھیر اوندھے منہ لیٹا کھڑکی کے باہر پیپل کے لرزتے ہوئے پتوں پر بارش کے قطروں کا رقص دیکھ رہا تھا، ایک گوری چٹی لڑکی اپنے ستر کو ننگے جسم سے چھپانے کی ناکام کوشش کرتے کرتے غالباً سو گئی تھی —— اس کی لال ریشمی شلوار دوسرے پلنگ پر پڑی تھی۔ اس کے گہرے سُرخ ازاربند کا ایک پھندنا نیچے لٹک رہا تھا۔ اس پلنگ پر اس کے دوسرے اُترے ہوئے کپڑے بھی پڑے تھے۔ اس کی سنہرے پھولوں والی قمیص، انگیا، جانگیا اور دوپٹہ —— سب کا رنگ سُرخ تھا، بے حد سُرخ۔ یہ سب کپڑے حنا کے عطر کی تیز خوشبو میں بسے ہوئے تھے۔

لڑکی کے سیاہ بالوں میں مقیش کے ذرّے گرد کی طرح جمے ہوئے تھے۔ چہرے پر غازے، سُرخی اور مقیش کے ان ذرات نے مل جل کر ایک عجیب و غریب رنگ پیدا کر دیا تھا، بے جان سا، اُڑا اُڑا اور اس کے گورے سینے پر انگیا کے کچے رنگ نے جا بجا لال لال دھبے ڈال دیے تھے۔

چھاتیاں دُودھ کی طرح سفید تھیں جس میں تھوڑی تھوڑی نیلاہٹ بھی ہوتی ہے۔ بغلوں کے بال مُنڈے ہوئے تھے جس کے باعث وہاں سُرمئی غبار سا پیدا ہو گیا تھا۔ رندھیر کئی بار اس لڑکی کی طرف دیکھ کر سوچ چکا تھا: کیا ایسا نہیں لگتا جیسے میں نے ابھی ابھی کیلیں اکھیڑ کر اسے لکڑی کے بند بکس میں سے نکالا ہے، کتابوں اور چینی کے برتنوں کی طرح کیونکہ جس طرح کتابوں پر داب کے نشان ہوتے ہیں اور چینی کے برتنوں پر ملنے جلنے سے خراشیں آ جاتی ہیں، ٹھیک اسی طرح اس لڑکی کے بدن پر کئی جگہ ایسے نشان تھے۔

جب رندھیر نے اس کی تنگ اور چُست انگیا کی ڈوریاں کھولی تھیں تو پیٹھ پر اور سامنے سینے کے نرم نرم گوشت پر جھرّیاں سی بنی ہوئی تھیں اور کمر کے اردگرد کس کر بندھے ہوئے ازاربند کا نشان —— وزنی اور نوکیلے جڑاؤ نکلیس

ے اس کے سینے پر کئی جگہ خراشیں پیدا ہو گئی تھیں جیسے ناخنوں سے بڑے زور کے ساتھ کھجایا گیا ہو۔ برسات کے وہی دن تھے۔ پیپل کی نرم نرم کومل پتیوں پر بارش کے قطرے گرنے سے ویسی ہی آواز پیدا ہو رہی تھی جیسی کہ رندھیر اس روز تمام رات سنتا رہا۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی لیکن اس میں حنا کے عطر کی تیز خوشبو گھلی ہوئی تھی۔

رندھیر کے ہاتھ بہت دیر تک اس گوری چٹی لڑکی کے کچے دودھ ایسے سفید سینے پر ہوائی لمس کی طرح پھرتے رہے۔ اس کی انگلیوں نے اس گورے گورے جسم میں کئی ارتعاش دوڑتے ہوئے محسوس کیے۔ اس نرم نرم جسم کے کئی گوشوں میں اسے سمٹی ہوئی کپکپاہٹوں کا بھی پتہ چلا۔ جب اس نے اپنا سینہ اس کے سینے کے ساتھ ملایا تو رندھیر کے جسم کے ہر مسام نے اس لڑکی کے چھیڑے ہوئے تاروں کی آواز سنی ——— لیکن وہ پکار کہاں تھی، وہ پکار جو اس نے گھاٹن لڑکی کے جسم کی بو میں سونگھی تھی، وہ پکار جو دودھ کے پیاسے بچے کے رونے سے کہیں زیادہ قابلِ فہم تھی، وہ پکار جو صوتی حدود سے نکل کر بے آواز ہو گئی تھی۔

رندھیر سلاخوں والی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ اس کے بہت قریب پیپل کے پتے لرز رہے تھے مگر وہ ان کی لرزشوں کے اس پار دور بہت دور دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا، جہاں اسے مٹیلے بادلوں میں ایک عجیب قسم کی دھندلی روشنی گھلی ہوئی دکھائی دیتی تھی، جیسے اس گھاٹن لڑکی کے سینے میں اسے نظر آئی تھی، ایسی روشنی جو راز کی بات کی طرح چھپی ہوئی مگر ظاہر تھی۔

رندھیر کے پہلو میں ایک گوری چٹی لڑکی جس کا جسم دودھ اور گھی ملے آٹے کی طرح ملائم تھا، لیٹی تھی۔ اس کے سوئے ہوئے جسم سے حنا کے عطر کی خوشبو آرہی تھی جو اب تھکی تھکی معلوم ہوتی تھی۔ رندھیر کو یہ دم توڑتی اور حالتِ نزع کو پہنچی ہوئی خوشبو بہت ناگوار معلوم ہوئی۔ اس میں کچھ کھٹاس سی تھی، ایک عجیب قسم کی کھٹاس جو بدہضمی کی ڈکاروں میں ہوتی ہے، اداس، بے رنگ، بے کیف۔

رندھیر نے اپنے پہلو میں لیٹی ہوئی لڑکی کی طرف دیکھا۔ جس طرح پھٹے ہوئے دودھ میں سفید سفید بے جان پھٹکیاں بے رنگ پانی میں ساکن ہوتی ہیں، اسی طرح اس لڑکی کی نسوانیت اس کے وجود میں ٹھہری ہوئی تھی، سفید سفید دھبوں کی صورت میں۔ اصل میں رندھیر کے دل و دماغ میں وہ بو بسی ہوئی تھی جو اس گھاٹن لڑکی کے جسم سے بغیر کسی بیرونی کوشش کے باہر نکلی تھی۔ وہ بو جو حنا کے عطر سے کہیں زیادہ ہلکی پھلکی اور دور رس تھی، جس میں سونگھے جانے کا اضطراب نہیں تھا، جو خود بخود ناک کے رستے داخل ہو کر اپنی صحیح منزل پر پہنچ گئی تھی۔

رندھیر نے آخری کوشش کرتے ہوئے اس لڑکی کے دودھیا لے جسم پر ہاتھ پھیرا مگر اسے کوئی کپکپاہٹ محسوس نہ ہوئی۔ اس کی نئی نویلی بیوی جو فرسٹ کلاس مجسٹریٹ کی لڑکی تھی، جس نے بی اے تک تعلیم پائی تھی اور جو اپنے کالج میں سینکڑوں لڑکوں کے دل کی دھڑکن تھی، رندھیر کی نبض تیز نہ کر سکی ——— وہ حنا کی مرتی ہوئی خوشبو میں اس بو کی جستجو کرتا رہا جو برسات کے انہی دنوں میں جب کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے بارش میں نہا رہے تھے، اسے گھاٹن لڑکی کے میلے جسم سے آئی تھی۔

دستاویز

سینتالیس

سر کھجاتا ہے جہاں زخم سر اچھا ہو جائے
لذتِ سنگ باندازۂ تقریر نہیں

غالب

لذتِ سنگ

لاہور کے ایک رسوائے عالم رسالے میں جو فحاشی و بیہودگی کی اشاعت کو اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے، ایک افسانہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "بو" اور اس کے مصنف ہیں مسٹر سعادت حسن منٹو ——— اس افسانے میں فوجی عیسائی لڑکیوں کا کیریکٹر اس درجہ گندہ بتایا گیا ہے کہ کوئی شریف آدمی برداشت نہیں کر سکتا۔ افسانہ نگار نے اظہار مطلب کے لیے جو اسلوب اختیار کیا ہے اور جو الفاظ منتخب کیے ہیں، ان کے لیے تہذیب و شرافت کے دامن میں کوئی جگہ نہیں ہو سکتی، لیکن حکومت اب تک خاموش ہے۔ یہی حکومت "لذت النسا" اور "کوک شاستر" ایسی فنی کتابوں کو بھی قابلِ مواخذہ سمجھتی ہے لیکن ایسے افسانوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتی جو ادبِ جدید کے نام سے سفلی جذبات میں ہلچل ڈالنے کا موجب ہیں اور (اسی حکومت نے) فحاشت نگار ادیبوں کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے ——— وہ قانون کی گرفت سے بے نیاز ہو کر گندگی بکھیرتے رہتے ہیں۔

——— ہفتہ وار "خیام"، لاہور۔

پریس برانچ کے انچارج چودھری محمد حسین بہت نیک خیال کے بزرگ ہیں۔ اس قسم کے افسانے پڑھ کر ان کی روح یقیناً کانپ اٹھی ہوگی۔ ان کے ہاتھ میں قانون ہے اور وہ اسے نہایت سختی سے استعمال کر سکتے ہیں۔ کیا ان کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ جس طرح قابلِ اعتراض مذہبی مضامین لکھنے والوں کے خلاف گورنمنٹ کی مشینری حرکت میں آتی ہے، اسی طرح وہ ان گندے افسانوں کو لکھنے والوں سعادت حسن منٹو وغیرہ، چھاپنے والے پبلشروں جو رسالے کی فروخت سے ہزاروں روپے کماتے ہیں، اور چھاپنے والے پریس کے مالکوں کو فوراً گرفتار کر لیتے اور ان میں سے ایک ایک کو تین تین سال کے لیے جیلوں میں بند کرا دیتے ——— ہمیں یقین ہے کہ کوئی بھی عدالت ان افسانوں کو قانون کی رو سے نہیں بچنے دے گی۔ یہ (افسانے) صاف طور سے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں بد اخلاقی پھیلاتے ہیں اور عوام کا مذاق بگاڑتے ہیں۔

——— روزنامہ "پربھات" لاہور

"ادبِ لطیف" ——— اس نام کا ایک رسالہ لاہور سے شایع ہوتا ہے۔ یہ کہنے کو تو ایک ادبی ماہنامہ ہے لیکن اگر اسے ادبِ کثیف کہیں تو بجا ہے۔ اس کا سالانہ نمبر اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہے جس میں ایک لچر اور فحش افسانہ از قلم فحش نگار سعادت حسن منٹو شایع ہوا ہے جس کے خلاف ہم نہایت پرزور احتجاج کرتے ہیں۔ نہ فقط اس کے کوک شاستر نہ خیالات کی وجہ سے بلکہ اس لیے بھی کہ یہ گورنمنٹ عالیہ کی وہ سنیر الزلیری کور کی مساعی در بابِ جنگ کی راہ میں روڑا اٹکانے والا اور اس کی بدنامی کا موجب ہے۔ تعجب ہے کہ اس محکمہ کو یہ بیہودہ شخص تحبہ خانہ کا نام دیتا ہے ——— ہم حیران ہیں کہ اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر تو گورنمنٹ کی مشینری فوراً حرکت میں آجاتی ہے لیکن اس خلافِ تہذیب مضمون پر اس کی اب تک نظر نہیں پڑی۔ کیا سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ اس بد اخلاق اور بے ادب "ادیب" اور رسالہ مذکور کے خلاف جلد کوئی کارروائی نہ کریں گے؟ دیکھا جا رہے . . . !

——— "اخوت"، لاہور

ایک مقامی ماہنامہ نے سعادت حسن منٹو کا ایک فحش افسانہ "بو" شایع کیا تھا۔ "خیام" میں اس اخلاق سوز حرکت کے خلاف آواز اٹھائی گئی تھی جو حکومتِ پنجاب کے کانوں تک پہنچے بغیر نہ رہ سکی، چنانچہ معلوم ہوا ہے کہ جس پرچے میں "بو" شایع ہوا تھا، وہ ضبط کرلیا گیا ہے۔ یہ ضبطی ۲۹۲/۳۸ دفعہ کے ماتحت عمل میں آئی ہے ——— ہم اس فیصلے پر حکومتِ پنجاب کو مستحق تبریک سمجھتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ اس قسم کی فحاشی کو مستقل طور پر رد کرنے کے لیے کوئی موثر قدم اٹھائے گی۔

——— ہفتہ وار "خیام"، لاہور

۳،

ملک بلڈنگ،
میورروڈ،
لاہور۔

بھائی جان، سلام شوق!

برادرم آغا خلش صاحب کا گرامی نامہ پرسوں ملا تھا ——— آپ کی علالت کا علم ہوا۔ اللہ کرے، آپ اب اچھے ہوں۔ جب آپ کو اپنی صحت کا اندازہ ہے تو اتنا زیادہ کام کیوں کرتے ہیں کہ دنوں صاحبِ فراش رہتے ہیں۔ مجھے تو ڈاک میں اپنی صحت کی حالت سے مطلع کیجیے اور للہ اتنی محنت نہ کیجیے کہ آپ انجکشنوں کے کانٹوں میں گھرے رہ جائیں۔ ابھی برسوں تک آپ کی ضرورت ہے۔
لیجیے، "خیام"، "آئینہ" (بمبئی) اور دیگر مہربانوں کے دم سے "ادبِ لطیف" کا سالنامہ زیرِ دفعہ ۲۹۲ تعزیراتِ ہند اور ۳۸ ڈیفنس آف انڈیا رولز، ۲۹ مارچ کی شام کو ضبط ہو گیا ——— پولیس نے چھاپہ مارا۔ اور سالنامے کے باقی ماندہ نمبر لے گئی۔ ابھی پروپرائٹر اور ایڈیٹروں کی گرفتاری عمل میں نہیں آئی لیکن افواہ ہے کہ ہم بہت جلد گرفتار کر لیے جائیں گے ——— یہ ضبطی آپ کے مضمون افسانے کی وجہ سے عمل میں آئی ہے۔

احمد ندیم قاسمی
ایڈیٹر "ادبِ لطیف"

مضمون جس کا ذکر محولہ صدر خط میں ہے، ایک تقریر تھی جو میں نے جوگیشوری کالج بمبئی میں طالب علموں کو پڑھ کے سنائی تھی ——— اس سے پہلے چند اصحاب "ادبِ جدید" کے خلاف اس کالج میں تقریریں کر چکے تھے، یہی وجہ ہے کہ میں نے کالج کی مجلسِ ادب کی دعوت قبول کی اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ یہ تقریر بعد میں "ادبِ جدید" کے عنوان سے "ادبِ لطیف" کے زیرِ عتاب سالنامہ ۱۹۴۴ء میں میرے افسانے "بو" کے ساتھ شایع ہوئی ——— میں اسے ذیل میں نقل کرتا ہوں:

ادبِ جدید

میرے مضمون کا عنوان ادبِ جدید ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ مَیں اس کا مطلب ہی نہیں سمجھتا لیکن یہ زمانہ ہی کچھ ایسا ہے کہ لوگ اُسی چیز کے متعلق باتیں کرتے ہیں جن کا مطلب ان کی سمجھ میں نہیں آتا —— پچھلے دنوں گاندھی جی نے آغا خاں کے محل میں مرن برت رکھا۔ جب لوگوں کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کس طرح زندہ رہ سکے ہیں تو ایک نارنگی پیدا کر دی گئی۔ یہ نارنگی بھی کچھ دنوں کے بعد ناقابلِ فہم ہو گئی۔ بعض آدمیوں نے کہا کہ نارنگی نہیں تھی، موسمی تھی۔ بعض نے کہا: نہیں، موسمی نارنگی ہرگز نہیں تھی، مالٹا تھا —— بات بڑھتی گئی۔ چنانچہ اس پھل کی ساری ذاتیں گنوا دی گئیں: نارنگی، سنگترہ، موسمی، مالٹا، چکوترہ، سویٹ لائم، کھٹا لیموں، میٹھا لیموں، وغیرہ وغیرہ۔ پھر ڈاکٹروں نے ان میں سے ہر ایک کی وٹامنز گنوائیں۔ غذائیت کو کیلوریز میں تقسیم کیا گیا۔ ایک برس میں پچھتر برس کے بڈھے کو کتنی کیلوریز کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس پر بحث کی گئی اور صاحب، گاندھی جی کی یہ نارنگی یا موسمی، جو کچھ بھی تھی، وہ سعادت حسن منٹو بن گئی —— یہ میرا نام ہے لیکن بعض لوگ ادبِ جدید المعروف نئے ادب، یعنی ترقی پسند ادب کو سعادت حسن منٹو بھی کہتے ہیں اور جنھیں صنفِ کرخت پسند نہیں، وہ اُسے عصمت چغتائی بھی کہہ لیتے ہیں۔

جس طرح مَیں یعنی سعادت حسن منٹو اپنے آپ کو نہیں سمجھتا، اسی طرح ادبِ جدید المعروف نیا ادب یعنی ترقی پسند لٹریچر بھی میری فہم سے بالاتر ہے اور جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، ان لوگوں کی سمجھ سے بھی اونچا ہے جو اس کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر چند مضمونوں میں اس ادب کو جس کے کئی نام ہیں، اور زیادہ نام دینے کے لیے فحش نگاری اور مزدور پرستی سے بھی منسوب کیا گیا ہے۔

میں چیزوں کے نام رکھنے کو بُرا نہیں سمجھتا۔ میرا اپنا نام اگر نہ ہوتا تو وہ گالیاں کسے دی جاتیں جو اب تک ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں مَیں اپنے نقادوں سے وصول کر چکا ہوں —— نام ہو تو گالیاں اور شاباشیاں دینے لینے میں بہت سہولت پیدا ہو جاتی ہے لیکن اگر ایک ہی چیز کے بہت سے نام ہوں تو الجھاؤ پیدا ہونا ضروری ہے۔

سب سے بڑا الجھاؤ اس ترقی پسند ادب کے بارے میں پیدا ہوا ہے حالانکہ پیدا نہیں ہونا چاہیے تھا —— یا تو ادب ہے ورنہ ادب نہیں ہے۔ آدمی یا تو آدمی ہے ورنہ آدمی نہیں ہے، گدھا ہے، مکان ہے، میز ہے یا اور یز ہے —— کہا جاتا ہے: سعادت حسن منٹو ترقی پسند انسان ہے —— یہ کیا بیہودگی ہے۔ سعادت حسن سان ہے اور ہر انسان کو ترقی پسند ہونا چاہیے۔ ترقی پسند کہہ کر لوگ میری صفت بیان نہیں کرتے بلکہ اپنی برائی

کا ثبوت دیتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود ترقی پسند نہیں ہیں یعنی وہ خود ترقی نہیں چاہتے ——— میں زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کا خواہش مند رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ سب ترقی کریں۔ آج آپ طالب علم ہیں، ترقی کرتے کرتے کل آپ بھی اپنے آئیڈیل تک پہنچ جائیں۔

ہر آدمی ترقی پسند ہے۔ وہ لوگ جنھیں تخریبی یا رجعت پسند کہا جاتا ہے، خود کو ترقی پسند ہی سمجھتے ہیں —— اور پھر ہر زمانے میں تقریباً ہر آدمی گذری ہوئی نسل کے مقابلے میں اپنے کو زیادہ ذہین، طبّاع اور ترقی یافتہ انسان ہی سمجھتا ہے۔ یہی حال ادب کا ہے۔ شرر کے ناول اور راشد الخیری کے قصّے آج کل کے اکثر مصنفین کو بالکل بے جان معلوم ہوتے ہیں۔ پڑھنے والوں کی بھی یہی کیفیت ہے۔ مارکیٹ میں چلے جائیے، آج سے دس بیس برس پہلے کے لکھنے والوں کی کتابیں اسٹالوں پر بہت کم دکھائی دیتی ہیں۔ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی اور سعادت حسن منٹو کی کتابیں ایم اسلم، تیرتھ رام فیروزپوری، سید امتیاز علی تاج اور عابد علی عابد کے مقابلے میں زیادہ پڑھی جاتی ہیں، اس لیے کہ کرشن چندر اور اس کے ہم عصر نوجوانوں نے زندگی کے نئے تجربے بیان کیے ہیں۔

آج سے بیس پچیس برس پہلے ملک کی سیاسی اور مجلسی حالت بالکل مختلف تھی ——— اسی طرح آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ پچاس ساٹھ برس اور پہلے کیسی ہوگی۔ اگر مغلیہ حکومت کا دور دورہ ہوتا تو بہت ممکن ہے، میرے گھر میں ایک حرم سرائے ہوتی۔ نہ ہوتی تو کم از کم ایک بیوی گھر میں ہوتی اور دو تین طوائفیں میری ملازمت میں ہوتیں۔ مجھے بٹیریں لڑانے کا شوق ہوتا۔ یہ مضمون پڑھنے کے بجائے میں پرنسپل صاحب بالقابہٗ کی شان میں ایک قصیدہ سُناتا جو خوش ہو کر یا تو میرا منہ موتیوں سے بھر دیتے یا جوگیشوری کالج مجھے بخش دیتے تاکہ میں اسے اپنا طویلہ بنا سکوں۔ مگر جیسا کہ آپ جانتے ہیں، حالت بہت مختلف ہے۔ مجھے یہاں سے پیدل اسٹیشن جانا پڑے گا اور فلمستان میں اپنے آقاؤں کو جواب دینا پڑے گا کہ میں اتنی دیر ڈاکٹر کے پاس کیا کرتا رہا ——— میں ان سے جھوٹ بول کے آیا ہوں کہ ڈاکٹر سے ٹیکہ لگوانے جا رہا ہوں۔

ہاں، تو میں عرض کر رہا تھا کہ حالات بہت مختلف ہیں اور حالات کا یہ اختلاف ہی ادب میں مختلف رنگ پیدا کرتا ہے۔ پہلے فارغ البالی تھی۔ لوگ آرام پسند اور عیش پرست تھے۔ اُس زمانے کے ادب میں آپ کو بہت سی دماغی عیاشیاں نظر آسکتی ہیں۔ وہ غنودگی بھی آپ محسوس کر سکتے ہیں جو اُس زمانے کے ادیبوں پر طاری تھی۔ اس زمانے میں شاعر اپنے اصیل مرغ کی جوانا مرگی پر زوردار نوحہ لکھتا تھا اور بہت بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا تھا۔ آج کا شاعر اپنی جوانا مرگی کے نوحے لکھتا ہے۔ اس عہد کا قصہ نویس جنوں اور پریوں کی داستانیں لکھ کر نام پیدا کرتا تھا۔ آج کا افسانہ نویس ان مردوں اور عورتوں کی کہانیاں لکھتا ہے جو جنوں اور پریوں سے کہیں زیادہ دلچسپ ہیں۔ اُس دور کا ادیب مطمئن انسان تھا۔ آج کا ادیب ایک غیر مطمئن انسان ہے۔ وہ اپنے ماحول، اپنے نظام، اپنی معاشرت، اپنے ادب، حتیٰ کہ اپنے آپ سے بھی غیر مطمئن ہے۔ اُس کی اس بے اطمینانی کو لوگوں نے غلط نام دے رکھے ہیں۔ کوئی اُسے ترقی پسندی کہتا ہے، کوئی فحش نگاری اور کوئی مزدور پرستی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان ادیبوں کے اعصاب پر عورت سوار ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہبوطِ آدم سے لے کر اب تک ہر مرد کے اعصاب پر عورت سوار رہی ہے۔ اور کیوں نہ رہے؟ مرد کے اعصاب پر کیا ہاتھی گھوڑوں کو سوار ہونا چاہیے؟ جب کبوتر کبوتریوں کو دیکھ کر گٹکتے ہیں تو مرد عورتوں کو دیکھ کر ایک غزل یا افسانہ کیوں نہ لکھیں؟ عورتیں کبوتریوں سے کہیں زیادہ دلچسپ، خوبصورت اور فکر خیز ہیں۔ کیا میں جھوٹ کہتا ہوں؟

آج سے کچھ عرصہ پہلے شاعری میں عورت کو ایک خوبصورت لڑکا بنا دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے کے

شاعروں نے اس میں کوئی مصلحت دیکھی ہوگی۔ مگر آج کے شاعر اس مصلحت کے خلاف ہیں۔ وہ عورت کے چہرے پر سبزے یا خط کے آغاز کو بہت ہی مکروہ اور خلافِ فطرت سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوسرے بھی اُس کو اس کی اصلی شکل میں ہی دیکھیں ——— خدا لگتی کہیے کیا آپ اپنی محبوبہ کے گالوں پر داڑھی پسند کریں گے؟

میں عرض کر رہا تھا کہ زمانے کی کروٹوں کے ساتھ ادب بھی کروٹیں بدلتا رہتا ہے۔ آج اُس نے جو کروٹ بدلی ہے، اس کے خلاف اخباروں میں مضمون لکھنا یا جلسوں میں زہر اُگلنا بالکل بیکار ہے۔ وہ لوگ جو ادب جدید کا، ترقی پسند ادب کا، فحش ادب کا، یا جو کچھ بھی یہ ہے، خاتمہ کر دینا چاہتے ہیں تو صحیح راستہ یہ ہے کہ ان حالات کا خاتمہ کر دیا جائے جو اس ادب کے محرک ہیں۔

محمود آباد کے راجہ صاحب کا، حیدر آباد کے شاعر ماہر القادری صاحب کا یا بمبئی کے دوا فروش حکیم مرزا حیدر بیگ صاحب کا اس لٹریچر کے خلاف ریزولیوشن پاس کرنا بالکل بیکار ہے ——— جب تک عورتوں اور مردوں کے جذبات کے درمیان ایک موٹی دیوار حائل رہے گی، عصمت چغتائی اُس کے چُونے کو اپنے تیز ناخنوں سے کریدتی رہے گی، جب تک کشمیر کے حسین دیہاتوں میں شہروں کی گندگی پھیلتی رہے گی، غریب کرشن چندر ہولے ہولے روتا رہے گا، جب تک افسانوں میں اور خاص طور پر سعادت حسن منٹو میں کمزوریاں موجود ہیں، وہ خوردبین سے دیکھ دیکھ کر باہر نکالتا رہے گا اور دوسروں کو دکھاتا رہے گا ——— راجہ صاحب محمود آباد اور ان کے ہم خیال کہتے ہیں: یہ سراسر بیہودگی ہے۔ تم جو کچھ لکھتے ہو، خرافات ہے ——— میں کہتا ہوں، بالکل درست ہے۔ اس لیے کہ میں بیہودگیوں اور خرافات ہی کے متعلق تو لکھتا ہوں۔ راجہ صاحب محمود آباد ایک کانفرنس کے صدر بن جائیں یا حکیم حیدر بیگ صاحب کھانسی دُور کرنے کا مجرب شربت ایجاد کر لیں، مجھے ان کی صدارت اور ان کے شربت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ البتہ جب میں ٹرین میں بیٹھا بیٹھا اپنا نیا خریدا ہوا قیمتی پن نکالتا ہوں، صرف اس غرض سے کہ لوگ دیکھیں اور مرعوب ہوں تو مجھے اپنا سفلہ پن بہت دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ میرے پڑوس میں اگر کوئی عورت ہر روز خاوند سے مار کھاتی ہے اور پھر اُس کے جوتے صاف کرتی ہے تو میرے دل میں اُس کے لیے ذرہ برابر ہمدردی پیدا نہیں ہوتی لیکن جب میرے پڑوس میں کوئی عورت اپنے خاوند سے لڑکر اور خودکشی کی دھمکی دے کر سنیما دیکھنے چلی جاتی ہے اور میں خاوند کو دو گھنٹے سخت پریشانی کی حالت میں دیکھتا ہوں تو مجھے دونوں سے ایک عجیب و غریب قسم کی ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔ کسی لڑکے کو لڑکی سے عشق ہو جائے تو میں اسے زکام کے برابر بھی اہمیت نہیں دیتا مگر وہ لڑکا میری توجہ کو ضرور اپنی طرف کھینچے گا جو ظاہر کرے کہ اس پر سینکڑوں لڑکیاں جان دیتی ہیں لیکن درحقیقت وہ محبت کا اتنا ہی بھوکا ہے جتنا بنگال کا فاقہ زدہ باشندہ۔ اس بظاہر کامیاب عاشق کی رنگین باتوں میں جو ٹریجڈی سسکیاں بھرتی ہوگی، اس کو میں اپنے دل کے کانوں سے سنوں گا اور دوسروں کو سناؤں گا۔ چکی پیسنے والی عورت جو دن بھر کام کرتی ہے اور رات کو اطمینان سے سو جاتی ہے، میرے افسانوں کی ہیروئن نہیں ہو سکتی۔ میری ہیروئن چکلے کی ایک ٹکھیائی رنڈی ہو سکتی ہے جو رات کو جاگتی ہے اور دن کو سوتے میں کبھی کبھی یہ ڈراؤنا خواب دیکھ کر اٹھ بیٹھتی ہے کہ بڑھاپا اُس کے دروازے پر دستک دینے آیا ہے۔ اُس کے بھاری بھاری پپوٹے جن پر برسوں کی اُچٹتی ہوئی نیندیں منجمد ہو گئی ہیں، میرے افسانوں کا موضوع بن سکتے ہیں۔ اس کی غلاظت، اُس کی بیماریاں، اُس کا چڑچڑاپن، اُس کی گالیاں، یہ سب مجھے بھاتی ہیں۔ میں ان کے متعلق لکھتا ہوں اور گھریلو عورتوں کی شستہ کلامیوں، ان کی صحت اور ان کی نفاست پسندی کو نظر انداز کر جاتا ہوں۔

اعتراض کیا جاتا ہے کہ نئے لکھنے والوں نے عورت اور مرد کے جنسی تعلقات ہی کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ میں سب کی طرف سے جواب نہیں دوں گا۔ اپنے متعلق اتنا کہوں گا کہ یہ موضوع مجھے پسند ہے۔ کیوں ہے؟ بس ہے۔ سمجھ لیجیے کہ مجھ میں perversion ہے اور اگر آپ عقلمند ہیں، چیزوں کے عواقب و عواطف اچھی طرح جانچ سکتے ہیں تو سمجھ لیں گے کہ یہ بیماری مجھے کیوں لگی ہے —— زمانے کے جس دور سے ہم اس وقت گزر رہے ہیں، اگر آپ اس سے ناواقف ہیں تو میرے افسانے پڑھیے۔ اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ زمانہ ناقابلِ برداشت ہے۔ مجھ میں جو برائیاں ہیں، وہ اس عہد کی برائیاں ہیں۔ میری تحریر میں کوئی نقص نہیں۔ جس نقص کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے، دراصل موجودہ نظام کا نقص ہے —— میں ہنگامہ پسند نہیں۔ میں لوگوں کے خیالات و جذبات میں ہیجان پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ میں تہذیب و تمدن کی اور سوسائٹی کی چولی کیا اتاروں گا جو ہے ہی ننگی۔ میں اسے کپڑے پہنانے کی کوشش بھی نہیں کرتا، اس لیے کہ یہ میرا کام نہیں، درزیوں کا ہے —— لوگ مجھے سیاہ قلم کہتے ہیں لیکن میں تختۂ سیاہ پر کالی چاک سے نہیں لکھتا، سفید چاک استعمال کرتا ہوں کہ تختۂ سیاہ کی سیاہی اور بھی زیادہ نمایاں ہو جائے۔ یہ میرا خاص انداز، میرا خاص طرز ہے جسے فحش نگاری، ترقی پسندی اور خدا معلوم کیا کیا کچھ کہا جاتا ہے —— لعنت ہو سعادت حسن منٹو پر، کم بخت کو گالی بھی سلیقے سے نہیں دی جاتی . . .

جب میں نے لکھنا شروع کیا تھا تو گھر والے سب بیزار تھے۔ باہر کے لوگوں کو بھی حسبِ معمول میرے ساتھ دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ وہ کہا کرتے تھے: "بھئی کوئی نوکری تلاش کرو۔ کب تک بیکار پڑے افسانے لکھتے رہوگے . . ." آٹھ دس برس پہلے افسانہ نگاری بیکاری کا دوسرا نام تھا۔ آج اسے ادبِ جدید کہا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے ذہن نے کافی ترقی کر لی ہے۔ وہ وقت بھی آ جائے گا جب اس جدید ادب کا صحیح مطلب واضح ہو جائے گا اور حکیم حیدر بیگ صاحب دہلوی کو اپنے شفا خانے سے اٹھ کر نئے لکھنے والوں کے روگ کی تشخیص نہیں کرنا پڑے گی۔

جب سے جنگ شروع ہوئی ہے، ادبِ جدید پر ایک نئے زاویے سے حملہ کیا جا رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب ساری دنیا جنگ کے شعلوں میں لپٹی ہے، ہر روز ہزاروں انسانوں کا خون مٹی میں مل رہا ہے، فضا بادۂ ہر جام بنی ہے، دوسری اجناس کی طرح انسانوں کے گوشت پوست کی دکانیں بھی کھلی ہیں تو نئے لکھنے والے کیوں خاموش ہیں؟ کیا ان کے قلم صرف جنسیات کی روشنائی ہی میں ڈوبتے ہیں؟ دنیا کا نقشہ بدل رہا ہے، ہر لحظہ، ہر گھڑی ایک نئے طوفان کا پیغام لا رہی ہے مگر ان کے دل و دماغ پر ایسا جمود طاری ہے کہ دور ہی نہیں ہوتا۔

میں پھر دوسروں کی طرف سے جواب نہیں دوں گا۔ اپنے متعلق عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دنیا کا نقشہ واقعی بدل رہا ہے لیکن اگر میں نے اس کے متعلق کچھ لکھا تو میرا ابھی حلیہ بدل جائے گا۔ ڈرپوک آدمی ہوں، جیل سے بہت ڈر لگتا ہے۔ یہ زندگی جو بسر کر رہا ہوں، جیل سے کم تکلیف دہ نہیں۔ اگر اس جیل کے اندر ایک اور جیل پیدا ہو جائے اور مجھے اس میں ٹھونس دیا جائے تو چٹکیوں میں میرا دم گھٹ جائے گا۔ زندگی سے مجھے پیار ہے۔ حرکت کا دلدادہ ہوں۔ چلتے پھرتے سینے میں گولی کھا سکتا ہوں لیکن جیل میں کھٹمل کی موت نہیں مرنا چاہتا۔ یہاں اس پلیٹ فارم پر یہ مضمون سناتے سناتے آپ سب سے مار کھا لوں گا اور اُف تک نہیں کروں گا لیکن ہندو مسلم فساد میں اگر کوئی میرا سر پھوڑ دے تو میرے خون کی ہر بوند روتی رہے گی۔ میں آرٹسٹ ہوں، اوچھے زخم اور بھدے گھاؤ

مجھے پسند نہیں ——— جنگ کے بارے میں کچھ لکھوں اور دل میں پستول دیکھنے اور اس کو چھونے کی حسرت دبائے کسی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں مر جاؤں، ایسی موت سے تو یہی بہتر ہے کہ لکھنا وکھنا چھوڑ کر ڈیری فارم کھول لوں اور پانی ملا دودھ بیچنا شروع کر دوں۔ گولے اور تارپیڈو تو ایک طرف رہے میں نے آج تک ہوائی بندوق بھی نہیں چلائی ——— بچپن کی بات ہے، ہمارے پڑوس میں ایک تھانے دار رہتے تھے۔ ان کے پاس ایک پستول تھا۔ پیٹی اتار کر جب وہ پلنگ پر رکھتے تو سب بچوں سے کہہ دیا جاتا: "دیکھو اس کمرے میں مت جانا، وہاں پستول پڑا ہے" کبھی ہم ڈرتے ڈرتے اس کمرے میں چلے جاتے۔ دور کھڑے رہ کر اس خطرناک آلے کی طرف دیکھتے تو دل دھک دھک کرنے لگتا۔ ایسا محسوس ہوتا کہ پڑے پڑے وہ پستول درغ جائے گا۔ . . اب آپ ہی بتائیے: میں اور میرے دوست ٹینکوں کے بارے میں کیا لکھیں گے ——— مجھے چست وردی پہننے کا شوق نہیں ہے۔ پیتل اور تانبے کے تمغوں اور کپڑے کے رنگین بلّوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ ہوٹلوں میں ڈانس کر کے، کلبوں میں شراب پی کر اور ٹیکسیوں میں مجونانہ کتھا لگی لڑکیوں کے ساتھ گھوم کر میں وار الفرٹ کی مدد کرنا نہیں چاہتا۔ اس سے کہیں زیادہ دلچسپ مشاغل مجھے میسر ہیں۔ مثال کے طور پر یہ مشغلہ کیا برا ہے کہ میں ہر روز بمبئی سنٹرل سے گورے گاؤں اور گورے گاؤں سے بمبئی سنٹرل تک برقی ٹرین میں سینکڑوں وردی پوش فوجیوں کو دیکھتا ہوں جو فتح و نصرت کو اور زیادہ قریب لانے کے لیے شراب کے نشے میں مدہوش یا ٹانگیں پسارے سو رہے ہوتے ہیں یا نہایت ہی بدنما عورتوں سے، میری موجودگی سے غافل، نہایت ہی واہیات قسم کا رومانس لڑانے میں مصروف ہوتے ہیں۔

میں اس جنگ کے بارے میں کچھ نہیں لکھوں گا لیکن جب میرے ہاتھ میں پستول ہوگا اور دل میں یہ دھڑکا نہیں رہے گا کہ یہ خود بخود چل پڑے گا تو میں اسے لہراتا ہوا باہر نکل جاؤں گا اور اپنے اصلی دشمن کو پہچان کر یا تو ساری گولیاں اس کے سینے میں خالی کر دوں گا یا خود چھلنی ہو جاؤں گا۔ اس موت پر جب میرا کوئی نقاد یہ کہے گا کہ پاگل تھا تو میری روح ان لفظوں ہی کو سب سے بڑا تمغہ سمجھ کر اٹھا لے گی اور اپنے سینے پر آویزاں کر لے گی . . .

منٹو نے "ادبِ جدید" یکم جنوری، ۱۹۴۴ء کو لکھا تھا، اور مکمل طور پر یہ مضمون "ادبِ لطیف" کے سالنامے (۱۹۴۴ء) میں شائع ہوا تھا۔ "لذتِ سنگ" میں بھی یہ مضمون مکمل طور پر موجود ہے لیکن ناقص ترتیب اور اشاعت کی وجہ سے نمایاں نہیں ہے ——— جب اس مضمون کو منٹو نے "منٹو کے افسانے" (پہلا مجموعہ) کی دوسری اشاعت سے "پیش لفظ" کے طور پر استعمال کرنا شروع کیا تو (عربی رسم الخط میں کتابت شدہ) مندرجہ بالا سطریں نکال دیں۔

اس تقریر یا مضمون پر حکومت پنجاب نے زیرِ دفعہ ۳۸ ڈیفنس آف انڈیا رولز مقدمہ چلایا —— الزام یہ تھا کہ اس میں حضور ملک معظم کی نورسنر کے متعلق ایسی غلط باتیں موجود ہیں جن سے ان کو ضعف پہنچ سکتا ہے۔

"بو" پر جو اس کتاب کا پہلا افسانہ ہے، صرف فحاشی کا الزام تھا۔

مقدمہ، جیسا کہ ظاہر ہے، لاہور میں چودھری برکت علی ولد چودھری محمد نتھو، ساکن لاہور (مالک ادبِ لطیف)، چودھری نذیر احمد ولد چودھری غلام حسین، قوم الرائی، ساکن لاہور (ایڈیٹر)، پیرزادہ احمد ندیم قاسمی، ساکن لاہور (ایڈیٹر)، سعادت حسن منٹو ولد غلام حسن، ساکن بمبئی کے خلاف مسٹر بنواری لال کی عدالت میں پیش ہوا۔

مجھے بمبئی سے بہت ضروری کام چھوڑ کر حاضر ہونا پڑا۔

لاہور پہنچا تو خیال تھا کہ مجھے گرفتار کرلیا جائے گا کیونکہ میرے وارنٹ جاری ہو چکے تھے مگر سب انسپکٹر صاحب نے جن سے اتفاقیہ "مکتبہ اردو" میں ملاقات ہوگئی، مجھ سے کہا کہ میں صبح دوسرے ملزمین کے ساتھ عدالت میں حاضر ہو جاؤں۔

گورنمنٹ کالج کے بالکل سامنے گرد و غبار میں اَٹی ہوئی اینٹوں کی دومنزلہ عمارت ہے جسے "ضلع" کہتے ہیں شاید جگت کے طور پر —— اس عمارت کے ایک کمرے میں ہم سب ملزم پیش ہوئے۔

پہلے میری ضمانت ہوئی، اس کے بعد کارروائی شروع ہوئی —— میں اس سے پہلے اسی عدالت میں اپنے افسانے "کالی شلوار" کے مقدمے کے سلسلے میں پیش ہو چکا تھا، مجسٹریٹ صاحب چنانچہ میری طرف دیکھتے ہی مسکرا دیے۔

استغاثے کی گواہیاں ہوتی رہیں —— میں خاموش سنتا رہا، اس لیے کہ سب کی سب لایعنی، بیہودہ اور منطق و استدلال سے عاری تھیں۔

اسی روز میں نے اپنے وکیل مسٹر ہیرالال سیبل کی معرفت عدالت سے درخواست کی کہ میری حاضری آئندہ پیشیوں میں معاف کر دی جائے —— عدالت نے یہ درخواست منظور کر لی۔

اتفاق سے اُن دنوں میرے بڑے بھائی، خواجہ محمد حسن منٹو، بار ایٹ لا جزائر فجی سے لاہور آئے ہوئے تھے۔ میں نے ان کو اپنا افسانہ "بو" اور مضمون "ادبِ جدید" پڑھنے کے لیے دیا اور پوچھا کہ انجام کیا ہو گا۔

دونوں چیزیں بغور پڑھنے کے بعد انھوں نے جواب دیا: "میرا خیال ہے کہ استغاثے کی گواہیاں سننے کے بعد ہی مجسٹریٹ مقدمہ خارج کر دے گا۔ ۔ ۔"

—— لیکن ایسا نہ ہوا۔ میں بمبئی چلا آیا، وہاں لاہور میں فردِ جرم عائد ہو گیا اور دونوں چودھریوں اور

احمد ندیم قاسمی کو صفائی کے گواہ پیش کرنے میں کافی دوڑ دھوپ کرنی پڑی۔

اسی دوران میں مسٹر بنواری لال تبدیل ہو گئے اور ان کی جگہ چوہدری مہدی علی خاں متعین ہوئے۔ چونکہ یہ مقدمے کی تفصیل سے بخوبی واقف نہیں تھے۔ اس لیے فیصلہ مرتب کرنے میں کافی دیر ہو گئی۔

۲ مئی ۱۹۴۵ء کو چوہدری مہدی علی خاں نے بالآخر فیصلہ سُنا دیا ——— انھوں نے صرف اتنا کہا: "سعادت حسن منٹو بری ہے، اس لیے کہ مسٹر بنواری لال اسے پہلے ہی بری کر چکے ہیں۔۔۔"

میں نے سوچا، اگر ایسا ہی تھا تو مجھے بمبئی سے لاہور آنے کی زحمت کیوں دی گئی ——— احمد ندیم قاسمی بھی بری کر دیے گئے لیکن دونوں چوہدریوں کو ساٹھ روپے فی کس کے حساب سے جرمانہ ہوا۔ عدم ادائیگی کی صورت میں ایک ایک ماہ قیدِ بامشقت ——— مشقت کا نام سنتے ہی دونوں چوہدریوں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور جرمانہ ادا کر دیا۔

اس کے بعد چوہدری مہدی علی خاں کے فیصلے کے خلاف مسٹر ایم۔ آر۔ بھاٹیہ، ایڈیشنل جج کی عدالت میں اپیل کی گئی ——— فیصلہ ۲۴ نومبر ۱۹۴۵ء کو ہوا جس کا ترجمہ یہ ہے:

زیرِ نظر مقدمہ دفعہ ۲۹۲ تعزیراتِ ہند کے تحت ہے جس میں برکت علی اور نذیر احمد کو ساٹھ روپے جرمانہ اور عدم ادائیگی کی صورت میں ایک ماہ قید بامشقت کی سزا دی گئی ہے ——— اس سزا کے خلاف مجھ سے اپیل کی گئی ہے۔ ماتحت عدالتِ فاضلہ نے اپنے فیصلے میں یہ ریمارک کیا ہے کہ مضمون "بُو" کا مصنف سوسائٹی کی نظروں میں سخت ترین سزا کا مستحق تھا اور یہ کہ وہی صحیح آدمی تھا جسے قانونی گرفت میں لینا چاہیے تھا۔ مگر پیش رو فاضل جج (مسٹر بنواری لال) نے اُسے بری کر دیا۔

موجود ملزموں میں سے ایک پبلشر ہے اور دوسرا ایڈیٹر جس نے مضمون چھاپا ——— قابلِ غور امر ہے کہ ایسے اشخاص ملزمین کی صفائی میں پیش ہوئے جو اردو زبان کے عالم ہونے کی حیثیت میں بہت مشہور ہیں۔ مثال کے طور پر خان بہادر عبدالرحمٰن چغتائی، مسٹر کے۔ ایل۔ کپور، پروفیسر ڈی۔ اے۔ وی کالج، راجندر سنگھ بیدی اور ڈاکٹر آئی۔ ایل۔ لطیف، پروفیسر ایف سی۔ کالج جو بطور گواہانِ صفائی پیش ہوئے۔ ان سب کی رائے ہے کہ مضمون (بُو) میں ایسی کوئی چیز نہیں جو شہوانی حسیات پیدا کرے، بلکہ ان لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ مضمون ترقی پسند ہے اور اُردو ادب کے موڈرن رجحان سے تعلق رکھتا ہے حتیٰ کہ استغاثہ کے گواہ نمبر چار بشیر نے بھی دورانِ جرح میں تسلیم کیا کہ مضمون انسان کے اخلاق پر بُرا اثر نہیں ڈالتا۔

میری نظر میں مضمون ایک عشقیہ کہانی ہے، ایک لڑکے اور لڑکی کی جس میں ایسی بات کا دلچسپ ذکر ہے جو عموماً ہر روز نوجوان آدمیوں میں نہیں ہوتی۔

ماتحت عدالتِ فاضلہ نے ہندوستانی نوجوانوں کی تعیش پسند زندگی کا ذکر کرتے ہوئے افسوس کیا ہے اور اس بات پر ماتم کیا ہے کہ ملک میں ہندوستانیوں کا پرانا کیریکٹر نابود ہو رہا ہے۔

ماتحت عدالت کے فاضل جج نے وہ خوبیاں بھی یاد کرائی ہیں جن کے لیے ہم ہندوستانی کبھی مشہور تھے اور یہ نصیحت کی ہے کہ تنزیلینسوں کو ختم کر دینا چاہیے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ماتحت عدالتِ فاضلہ کے خیالات ترقی پسند نہیں ہیں ——— ہمیں زمانے کے ساتھ ساتھ چلنا ہے۔ حسین چیز ایک دائمی مسرت ہے۔ آرٹ جہاں کہیں بھی ملے ہمیں اس کی قدر کرنی چاہیے۔ آرٹ خواہ وہ تصویر کی صورت میں ہو یا مجسمے کی شکل میں، سوسائٹی کے لیے قطعی طور پر ایک پیش کش ہے، چاہے اس کا موضوع غیر مستور ہی کیوں نہ ہو ——— یہی کلیہ تحریروں پر بھی منطبق ہوتا ہے۔

جب ملک کے مشہور و معروف آرٹسٹوں اور ادیبوں نے ملزمین کے حق میں کہا ہے تو سارا فیصلہ یہیں ہو جاتا ہے ——— زیرِ بحث مضمون ایسا مضمون نہیں کہ جس پر کسی قانونی عدالت میں نکتہ چینی کی جائے۔ اس لیے مجھے اپیل منظور کرنے میں کوئی پس و پیش نہیں۔ جرمانہ اگر ادا کیا گیا ہے تو واپس کیا جائے ——— میں اپیل کرنے والوں کو بری کرتا ہوں۔

مجھے چونکہ "شہادت" کا رتبہ حاصل نہیں کرنا ہے اس لیے میں ان تکلیفوں کا ذکر نہیں کرنا چاہتا جو مجھے لاہور آنے جانے میں اٹھانی پڑیں ——— ایک لعنت سر سے دور ہو گئی یہی کافی تھا۔ مجھے ان اخباروں کے متعلق بھی کچھ نہیں کہنا ہے جن میں ہفتوں بلکہ مہینوں حکومت اور رعایا کو اخلاقیات کے سبق دیے جاتے رہے۔ افسوس صرف اتنا ہے کہ یہ پرچے ایسے لوگوں کی ملکیت ہیں جو عضوِ خاص کی لاغری اور کجی دور کرنے کے اشتہار خدا اور رسول کی قسمیں کھا کھا کر شایع کرتے ہیں لیکن اپنے ایڈیٹروں کی ٹیڑھی بنگی ٹانگوں اور ان کی جھکی ہوئی کمروں کا مطلق خیال نہیں کرتے ——— مجھے ان قلم سے مزدوری کرنے والوں سے دلی ہمدردی ہے۔ ان میں سے اکثر شریف آدمی ہیں جنھیں ادب سے دور کا بھی واسطہ نہیں لیکن چونکہ پرچہ چھپنا ہی چاہیے اور اس میں شروع سے لے کر آخر تک کچھ لکھا بھی ہونا چاہیے، اس لیے یہ مجبور انسان سیاست، سائنس اور ادب پر جو بھی ان کے ناتربیت یافتہ دماغوں میں آتا ہے کاغذ پر گھسیٹ دیتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ صحافت جیسے معزز پیشے پر ایسے لوگوں کا اجارہ ہے جن میں سے اکثر طلا فروش ہیں۔

پنجاب کی پریس برانچ کے متعلق میں "این دفترِ بے معنی" نہیں کہہ سکتا، اس لیے کہ یہ دفتر اپنے معنی وقتاً فوقتاً ضرورت کے مطابق نکالتا رہتا ہے ——— چند برسوں سے اس کے معنی یہ ہیں کہ علامہ اقبال مرحوم کے بعد خدائے عزّ و جل نے ادب کے تمام دروازوں میں تالے ڈال کر ساری چابیاں ایک نیک بندے کے حوالے کر دی ہیں۔ کاش علامہ مرحوم زندہ ہوتے!

پولیس کی عدالتیں تو خیر پولیس کی عدالتیں ہیں ——— اندھی روح اور گنجے فرشتے۔ . . ! اس

اندھی روح، گنجے فرشتوں، اور پنجاب کے طلافروش اخبار والوں اور رسالوں کے مالکوں اور ان کے مرغیل ایڈیٹروں کی بدولت ایک بار پھر مجھے لاہور کی اس عدالت میں حاضر ہونا پڑا جسے مجگت کے طور پر ضلع کہتے ہیں۔

اب کی مقدمہ ساقی بکڈپو دہلی کی شایع کردہ کتاب "دھواں" پر تھا —— الزام وہی فحاشی کا تھا۔ دو افسانے زیرِ عتاب تھے: کتاب کا پہلا افسانہ "دھواں" اور "کالی شلوار"۔

"کالی شلوار" پر عرصہ ہوا، قانونی پوسٹ مارٹم ہو چکا تھا اور سیشن کورٹ میں یہ فحاشی سے مبرا قرار دی جا چکی تھی۔ معلوم نہیں ایک بار پھر اس بے ضرر افسانے پر تعزیراتِ ہند کی دفعہ ۲۹۲ کیوں آزمائی گئی؟

اس دفعہ معاملہ کچھ زیادہ سنگین معلوم ہوا کیونکہ میرے اور مسٹر شاہد احمد دہلوی (مالک ساقی بک ڈپو) کے علاوہ وہ کاتب بھی گرفتار کر لیا گیا جس نے "دھواں" لکھنے کے گھناؤنے جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ وہ کتب فروش بھی گرفتار کیے گئے جن کے پاس یہ ملعون کتاب موجود تھی۔ پریس جس میں یہ چھپی تھی، اس کا مالک بھی دھر لیا گیا۔

میں سلیقے کا بہت قائل ہوں۔ ناگوار سے ناگوار چیز بھی اگر سلیقے کے ساتھ کی جائے تو مجھے ناگوار معلوم نہیں ہوتی —— لاہور سی۔ آئی۔ ڈی۔ کے ایک سب انسپکٹر نے جس کا نام شاید رام سروپ تھا، مجھے ۵ دسمبر ۱۹۴۴ء کو گورے گاؤں سے ملاڈ پولیس اسٹیشن بلوایا اور بغیر وارنٹ دکھائے گرفتار کر لیا —— میں نے وارنٹ کے متعلق استفسار کیا تو رام سروپ نے کہا: "پرائیوٹ کاغذات میں تمھیں نہیں دکھا سکتا۔"

یہ حرکت مجھے بُری معلوم ہوئی، چنانچہ میں نے شام کو گھر آ کر اپنے سولسٹر کو ٹیلی فون کیا جس نے مجھے بتایا کہ میری گرفتاری غیر قانونی ہے، اس لیے حسب الحکم لاہور کی عدالت میں حاضر ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔

میں نے ایسا ہی کیا لیکن ۸ جنوری ۱۹۴۵ء کو مجھے میرے مکان پر رات کے دس بجے قانونی طور پر گرفتار کر لیا گیا —— عصمت چغتائی (مسز شاہد لطیف) کے ساتھ بھی قریب قریب یہی سلوک ہوا۔

۴ فروری ۱۹۴۵ء کے "قومی جنگ" (بمبئی) میں "یہ ادب اور تہذیب پر حملہ ہے" کے عنوان سے ایک مضمون علی سردار جعفری کے قلم سے شایع ہوا جس کی ابتدائی سطور یہ ہیں:

> "اردو کے بہترین افسانہ نگاروں میں سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کے نام بہت مشہور ہیں —— حال ہی میں منٹو کے افسانوں کا ایک نیا مجموعہ "دھواں" اور عصمت کے افسانوں کا ایک نیا مجموعہ "چوٹیں" دہلی سے شایع ہوا ہے۔ ان مجموعوں میں دونوں افسانہ نگاروں کی بعض بہت اچھی کہانیاں شامل ہیں لیکن معلوم ہوا ہے کہ حکومت پنجاب نے عصمت اور منٹو کے بعض افسانوں کو عریاں قرار دے دیا ہے —— ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا ہے کہ عتاب کون سے افسانوں پر نازل ہوا ہے لیکن دونوں کتابیں زد میں ہیں —— مقدمے کی سماعت ابھی تک شروع نہیں ہوئی ہے۔ اسپیشل مجسٹریٹ کی عدالت میں ۲ فروری کو عصمت اور منٹو کی پیشی ہونے والی ہے —— لیکن عدالتی کارروائی سے پہلے ہی ان دونوں پر بہت کچھ گزر گئی ہے۔ دسمبر ۱۹۴۴ء کو بمبئی کی پولیس نے عصمت چغتائی کو بغیر وارنٹ کے گرفتار کر لیا اور ایک ہزار روپے

کی ضمانت پر رہا کیا۔ ۶ دسمبر کو عصمت کو دادر پولیس کورٹ میں حاضری دینی پڑی اور انھیں حکم ملا کہ ۶ جنوری ۱۹۴۵ء کو دوبارہ حاضر ہوں ——— جنوری میں پنجاب سے عصمت کا وارنٹ آگیا اور انھیں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ اس مرتبہ دو ہزار روپے کی ضمانت دے کر گلو خلاصی ہوئی اور حکم ملا کہ عصمت ۲ فروری کو لاہور کے اسپیشل مجسٹریٹ کی عدالت میں جاکر حاضری دیں ——— تقریباً یہی حشر سعادت حسن منٹو کا ہوا۔

سعادت حسن منٹو کا حشر کچھ زیادہ ہی قابلِ رحم تھا ——— مجھے اُن دنوں اعصابی درد کی شکایت تھی۔ گھر میں رات کے دس بجے جب مجھے گرفتار کیا گیا تو میں مارے درد کے کراہ رہا تھا۔ سینے پر گرم بوتل تھی لیکن حکمِ حاکم مرگِ مفاجات، لاہور حاضرِ عدالت ہونا ہی پڑا۔

اس دفعہ مقدمہ رائے صاحب لالہ سنت رام، اسپیشل مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش ہوا۔
ایک لطیفہ سُن لیجیے: عدالت میں داخل ہونے سے پہلے ایک ادھیڑ عمر کے شریف سے صاحب آئے اور مجھ سے ہاتھ ملا کر انھوں نے کہا: "آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔"
میں نے پوچھا: "آپ کا اسمِ گرامی؟"
ادھیڑ عمر کے شریف سے صاحب نے جواب دیا: "نانک چند ناز۔"
میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور کہا: "معاف کیجیے، مجھے آپ سے مل کر خوشی نہیں ہوئی۔ ۔ ۔"

لالہ نانک چند ناز استغاثہ کے معزز ترین گواہ تھے جو میرے اور عصمت چغتائی۔ دونوں کے خلاف بھگتے ——— آپ واقعی بھگتے۔
ایک اور لطیفہ سُن لیجیے: لالہ جی نے عصمت کے افسانے "لحاف" کے متعلق کہا کہ اس میں گندے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔
ہمارے وکیل مسٹر ہیرا لال نے پوچھا: "مثلاً۔ ۔ ۔"
لالہ جی نے "چوں میں" اٹھائی۔ کافی دیر "لحاف" کی ورق گردانی کے بعد ایک لفظ نکالا: "مثلاً عاشق!"
ہم سب مسکرا دیے۔
مسٹر ہیرا لال نے لالہ جی سے کہا: "یہ لفظ گندہ ہے تو آپ اس کی جگہ کوئی دوسرا تجویز کر دیجیے۔ ۔ ۔"
لالہ جی سوچنے لگے۔
مسٹر ہیرا لال نے پوچھا: "یار کیسا رہے گا؟"
اس دفعہ رائے صاحب لالہ سنت رام بھی مسکرا دیے۔

جب تک استغاثے کے گواہ پیش ہوتے رہے، ایسی مسکراہٹیں جاری رہیں لیکن عدالت برخاست ہونے سے پہلے جب ہمارے وکیل نے درخواست پیش کی کہ مجھے اور عصمت کو آئندہ پیشیوں میں حاضر ہونے سے

معاف کر دیا جائے اور جب مجسٹریٹ صاحب نے اسے مسترد کر دیا تو ہم دونوں کو یہ تکلیف دہ احساس ہوا کہ ہم عدالت میں پیش تھے اور ہم پر فحاشی کا سنگین جرم عائد تھا ——— مجھے اس کا بھی شدید احساس ہوا کہ سخت سردی ہے اور میں اعصابی درد میں مبتلا ہوں۔

عدالت سے باہر مسٹر ہیرالال سے مشورہ کیا گیا۔

ایک ہی صورت تھی کہ ہائی کورٹ میں اپیل کی جائے جو فوراً ہی داخل کر دی گئی ——— دوسرے روز میں اور عصمت آنریبل جسٹس اچھرو رام کی عدالت میں پیش ہوئے۔

آپ نے ہم دونوں کو غور سے دیکھا اور کہا: "مجھے آپ دونوں کے افسانے بہت پسند ہیں۔ ۔ ۔"

ہمیں بہت خوشی ہوئی لیکن انھوں نے اپیل کے کاغذات آنریبل جسٹس دین محمد کی عدالت میں منتقل کر دیے۔

اب پھر دوسرے روز حاضر ہونا تھا۔ شام کو میری طبیعت بہت زیادہ خراب ہو گئی۔ اتفاق سے میرا بھانجا میجر عبدالوحید اُن دنوں لاہور کے ملٹری ہسپتال میں متعین تھا۔ اس نے میرا ایکس رے لیا اور بتایا کہ مجھے ہائی ڈرو نیو موتھورکیس ہے یعنی میرے داہنے پھیپھڑے کے ایک حصے میں پانی اور مواد داخل ہو گئی ہے۔

میجر وحید کے کہنے پر میں نے دوسرے روز صبح سویرے کرنل امیر چند سے بھی تشخیص کرائی۔ انھوں نے بھی وہی مرض بتایا اور رائے دی کہ مجھے آرام کرنا چاہیے۔ میں نے ان سے سرٹیفیکیٹ لے لیا کہ شاید کام آجائے

سہ داشتہ آید بکار۔ ۔ ۔

دوسرے روز میں آنریبل جسٹس دین محمد کی عدالت میں پیش ہوا ——— عصمت غیر حاضر تھی۔

جسٹس دین محمد صاحب نے قہر آلود نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور بڑبڑائے: "ان لوگوں کا وجود ننگِ ادب ہے۔ ۔ ۔"

مجھے ایسا لگا جیسے میری قسمت پر مہر لگا دی گئی ہے۔

انھوں نے اپیل منظور کرنے سے انکار کر دیا لیکن جب میں نے اپنے وکیل سے کرنل امیر چند کا سرٹیفیکیٹ پیش کرنے کے لیے کہا تو اپیل ایک قہر آلود دستخط نے منظور کر دی۔

میں بمبئی واپس چلا آیا۔

بمبئی میں بہت دیر تک ڈاکٹروں میں یہ بحث ہوتی رہی کہ میرا مرض کیا ہے۔ میجر وحید اور کرنل امیر چند کی تشخیص یہ تھی کہ مجھے ہائی ڈرو نیو موتھورکیس ہے لیکن ڈاکٹر لیملا اور ڈاکٹر الیف۔ ڈبلیو۔ برجر (یا برگر) کی ایکس رے دیکھنے کے بعد یہ رائے تھی کہ صرف نیو موتھورکیس ہے۔ آخر یہ فیصلہ ہوا کہ ڈاکٹر ایچ۔ بی ہودی سے جو ریڈیالوجی کے ماہر ہیں، رجوع کیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے میرا پرانا ایکس رے دیکھنے اور نیا امتحان لینے کے بعد ڈاکٹر الیف۔ ڈبلیو۔ برجر (یا برگر) کو خط لکھا: مریض اس وقت نارمل حالت میں ہے۔ نیو موتھورکیس اور سیال مادہ بالکل غائب ہے۔ یہ کیس جیسا کہ ظاہر ہے، سپانٹینس نیو موتھورکیس کی قبیل سے تھا۔ ایسے چند کیس بعض اوقات کوخ میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ۔ ۔

اس 'کوخ' کا مطلب مجھے لاہور میں میجر وحید نے بتایا جب میں اس مقدمے کا فیصلہ سننے کے لیے گیا۔ مطلب یہ تھا کہ ایسے چند کیس بعض اوقات دق میں تبدیل ہو جاتے ہیں ——— لیکن دق اور مجھ میں اس

وقت ہوا جب میں نے صفائی کے گواہوں کی فہرست تیار کی اور رائے صاحب لالہ سنت رام نے ان کی گواہی بذریعہ کمیشن لینے سے انکار کر دیا۔ کوئی گواہ حیدرآباد میں تھا، کوئی لکھنؤ میں اور کوئی بمبئی میں۔ رائے صاحب مصر تھے کہ سب لاہور ہی میں حاضر ہوں۔

مکرمی نیاز فتحپوری صاحب کو جب لکھنؤ میں اس کی اطلاع ملی تو انھوں نے لکھا: یقیناً کمیشن کے ذریعے سے شہادت قلم بند ہو سکتی تھی اور اس میں بڑی آسانی تھی۔ تعجب ہے کہ مجسٹریٹ نے اسے منظور نہیں کیا اور آپ کے مشیرِ قانون نے کیوں اس پر زور نہ دیا۔۔۔

مجھے معلوم نہیں، مسٹر ہیرالال نے اس پر زور دیا تھا یا نہیں، بہر حال رائے صاحب لالہ سنت رام کا فیصلہ اٹل تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قاضی عبدالغفار صاحب، ایڈیٹر "پیام" حیدرآباد۔ لیفٹیننٹ کرنل قریشی (آئی۔ ایم۔ ایس، بمبئی)۔ نیاز فتحپوری صاحب۔ ایڈیٹر "نگار" لکھنؤ۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب۔ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (اس وقت پرنسپل، امر سنگھ کالج، سری نگر) ماسٹر ہریندر ناتھ چٹوپادھیائے، بمبئی جیسے اہل الرائے صاحبان کے خیالات سے نہ صرف میں بلکہ عدالت بھی محروم رہی۔

میں نے ان کو اور دوسرے حضرات کو گواہی کی دعوت ان الفاظ میں دی تھی:

بمبئی: ۲۰ ستمبر

مکرمی،

تسلیمات۔ لاہور کی عدالت میں میرے ایک افسانے "دھواں" پر فحاشی کے الزام میں مقدمہ چل رہا ہے۔ میں نے آپ کو گواہِ صفائی کے طور پر بلایا ہے۔ متذکرہ صدر افسانے کے بارے میں آپ کی جو رائے بھی ہو، مجھے منظور ہوگی، اس لیے کہ فحاشی اور غیر فحاشی کے اہم موضوع پر آپ جیسے اہل الرائے ادیب اور صاحبِ قلم کے خیالات نہ صرف میرے لیے بلکہ ملکی ادب کے لیے مفید ہوں گے۔

مجھے امید ہے کہ آپ میری یہ دعوت قبول فرمائیں گے۔ شکریہ۔

نیاز کیش
سعادت حسن منٹو

سب نے میری دعوت قبول کی جس کے لیے میں شکرگزار ہوں ——— ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب، سیکرٹری انجمن ترقی اردو (ہند) نے میرے عریضے کا جواب نہ دیا۔ بہت ممکن ہے ان تک پہنچا ہی نہ ہو ——— سردار دیوان سنگھ مفتون، ایڈیٹر "ریاست" کی طرف سے جب مجھے کوئی رسید نہ آئی تو مجھے بہت غصہ آیا کیونکہ مجھے ان کی دوستی پر ناز ہے۔

میں نے پھر ان کو لکھا۔

جواب آیا: آپ کا دوسرا خط ملا ——— میرا داخلہ پنجاب میں بند ہے اس لیے شہادت کیسے دوں۔ یہی میں نے سمن پر لکھ دیا تھا۔ اگر مجسٹریٹ پنجاب گورنمنٹ سے اجازت لے لے تو میں جانے کو تیار ہوں۔۔۔

ایک اور لطیفہ سُنیے : بمبئی سے میں نے لاہور میں پروفیسر موہن سنگھ دیوانہ کو گواہی دینے کے لیے لکھا —— سمن ان کے پاس پہلے پہنچ چکے تھے، میرا خط انھیں دیر کے بعد ملا۔ چنانچہ انھوں نے مجھے ایک کارڈ لکھا:

حضرت سلامت!

آپ کے وکیل سے ایک مرتبہ پہلے ملاقات ہوئی تھی۔ انھوں نے نہ مقدمے کی وجہ بیان کی، نہ یہ کہا کہ کس افسانے پر تم دھرے گئے ہو۔ چار کو پیشی تھی۔ دس بجے حاضرِ عدالت ہوا۔ سوا بارہ بجے تک دھوپ میں سڑتا رہا، ٹانگوں کو مسلتا اور بلغم نکالتا رہا —— : جائے نشستن نہ اذنِ رفتن، سوا بارہ بجے بلوایا گیا : "کیوں جی، وہ کہانیاں تم نے پڑھی ہیں . . . ؟" "حضور نہیں . . ." —— "برخواست" —— لنگڑاتا لنگڑاتا گھر پہنچا، دیکھا کہ ایک بڑے پیٹ والا لفافہ لیٹر بکس سے جھانک رہا ہے جس میں حضور کے ارشادات تھے —— میرا قصور یہ ہے کہ میں بے قصور ہوں۔ آپ خفا ہوں گے کہ ایک ہم پیشہ "قلم یار" نے یہ کیا حرکت کی۔ میں خفا ہوں کہ وکیل سُست، مؤکل سُست تر —— منٹو کو سُستی کی بیماری ہو، یقین نہیں آتا . . .

اور مجھے یہ یقین نہیں آتا کہ پروفیسر موہن سنگھ دیوانہ نے میری کہانیاں پڑھی ہی نہیں تھیں۔

غلطی مجھ سے بھی ہوئی کہ میں نے بڑے پیٹ والے لفافے" عین اس وقت بھیجے جب کہ سمن جاری ہو چکے تھے۔ ان لفافوں میں میں نے اپنے اس تحریری بیان کی نقل بھیجی تھی جو میں نے عدالت میں دیا تھا۔ چونکہ اس بیان کا میری تحریروں سے گہرا تعلق ہے، اس لیے میں اسے ذیل میں نقل کرتا ہوں :

تحریری بیان

مَیں ساقی بُک ڈپو، دہلی کی مطبوعہ کتاب بعنوان "دھواں" کا مصنف ہوں۔ یہ کتاب میں نے ۱۹۴۱ء میں جبکہ میں آل انڈیا ریڈیو، دہلی کا ملازم تھا، ساقی بُک ڈپو کے مالک میاں شاہد احمد صاحب کے پاس غالباً تین یا ساڑھے تین سو روپے میں فروخت کی تھی۔ اس کے جملہ حقوقِ اشاعت اب ساقی بُک ڈپو کے پاس ہیں۔

اس کتاب کے جو نسخے میں نے عدالت میں دیکھے ہیں، ان کے ملاحظے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے۔

چوبیس افسانوں کے اس مجموعے میں جو انسانی زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق ہیں۔ دو افسانے بعنوان "دھواں" اور "کالی شلوار" فحش ہیں —— مجھے اس سے اختلاف ہے کیونکہ یہ دونوں کہانیاں عریاں اور فحش نہیں ہیں۔

کسی ادب پارے کے متعلق ایک روزانہ اخبار کے ایڈیٹر، ایک اشتہار فراہم کرنے والے اور ایک سرکاری مترجم کا فیصلہ صائب نہیں ہو سکتا۔ بہت ممکن ہے کہ یہ تینوں کسی خاص اثر، کسی خاص غرض کے ماتحت اپنی رائے قائم کر رہے ہوں۔ اور پھر یہ بھی ممکن ہے کہ تینوں حضرات ایسی رائے دینے کے اہل ہی نہ ہوں کیونکہ کسی بڑے شاعر، کسی بڑے افسانہ نگار کے افسانوں پر صرف وہی آدمی تنقید کر سکتا ہے جو تنقید نگاری کے فن کے تمام عواقب و عواطف سے آگاہ ہو۔

استغاثے نے میرے ان دو افسانوں پر کوئی بصیرت افروز تنقید نہیں کی۔ صرف اتنا کہہ دینے سے کہ یہ دونوں افسانے فحش ہیں، اس آدمی کی جو روشنی کا خواہش مند ہے، جو اپنے عیوب و محاسن جاننا چاہتا ہے اور ان کی اصلاح کرنا چاہتا ہے، ہرگز ہرگز تسکین نہیں ہوتی —— میں اگر جواب میں صرف اتنا کہہ کر خاموش ہو جاؤں کہ یہ دونوں افسانے فحش نہیں ہیں تو ظاہر ہے کہ میں اندھیرے میں اور بھی اضافہ کر دوں گا۔ مگر میں ایسا نہیں کروں گا اور جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا، میں اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔

زبان میں بہت کم لفظ فحش ہوتے ہیں۔ طریقِ استعمال ہی ایک ایسی چیز ہے جو پاکیزہ سے پاکیزہ الفاظ کو بھی فحش بنا دیتا ہے۔ میرا خیال ہے، کوئی بھی چیز فحش نہیں، لیکن گھر کی کرسی اور ہانڈی بھی فحش ہو سکتی ہے، اگر ان کو فحش طریقے پر پیش کیا جائے —— فحش چیزیں بنائی جاتی ہیں کسی خاص غرض کے ماتحت۔

عورت اور مرد کا رشتہ فحش نہیں۔ ان کا ذکر بھی فحش نہیں، لیکن جب اس رشتے کو چوراسی آسنوں یا جوڑ دار خفیہ تصویروں میں تبدیل کر دیا جائے اور لوگوں کو ترغیب دی جائے کہ وہ تخلیے میں اس رشتے کو غلط زاویے سے دیکھیں تو میں اس فعل کو صرف فحش ہی نہیں بلکہ نہایت گھناؤنا، مکروہ اور غیر صحت مند کہوں گا۔

فحش اور غیر فحش میں تمیز کرنے کے لیے شاید یہ مثال کام دے سکے:

ایک آرٹ گیلری میں نمائش کے لیے ننگی عورتوں کی بہت سی تصویریں پیش ہوئیں۔ ان میں سے کسی نے بھی، جیسا کہ ظاہر ہے، دیکھنے والوں کا اخلاق خراب نہ کیا اور نہ ان کے شہوانی جذبات ہی کو ابھارا۔ البتہ ایک تصویر جس میں عورت کا سارا بدن تو کپڑوں میں مستور تھا، صرف ایک خاص حصہ اس ترکیب سے نیم عریاں چھوڑ دیا گیا تھا کہ دیکھنے والوں کے جذبات میں گدگدی سی ہوتی تھی، فحش قرار دی گئی ——— کیوں؟ اس لیے کہ آرٹسٹ کی نیت میں فرق تھا اور اس نے جان بوجھ کر لباس کو کچھ اس طرح اوپر اٹھا دیا تھا کہ دیکھنے والوں کے دل و دماغ میں ہلچل سی مچ جائے اور وہ اپنے تصور سے مدد لے کر اس نیم عریاں حصے کو عریاں دیکھنے کی کوشش کریں۔

تحریر و تقریر میں، شعر و شاعری میں، سنگ سازی و صنم تراشی میں فحاشی تلاش کرنے کے لیے سب سے پہلے اس کی ترغیب ٹٹولنی چاہیے۔ اگر یہ ترغیب موجود ہے، اگر اس کی نیت کا ایک شائبہ بھی نظر آ رہا ہے تو وہ تحریر، وہ تقریر، وہ شعر، وہ بت قطعی طور پر فحش ہے۔

اب ہمیں دیکھنا ہے کہ یہ ترغیب "دھواں" میں موجود ہے یا نہیں۔
آئیے، ہم اس افسانے کا تجزیہ کرتے ہیں۔

مسعود ایک کمسن لڑکا ہے۔ غالباً دس بارہ برس کا۔ اس کے جسم میں جنسی بیداری کی پہلی لہر کس طرح پیدا ہوتی ہے، یہ اس افسانے کا موضوع ہے ——— ایک خاص فضا اور چند خاص چیزوں کا اثر بیان کیا گیا ہے جو مسعود کے جسم میں دھندلے دھندلے خیالات پیدا کرتا ہے، ایسے خیالات جن کا رجحان جنسی بیداری کی طرف ہے۔ یہ بیداری وہ سمجھ نہیں سکتا لیکن غیر شعوری طور پر وہ محسوس ضرور کرتا ہے ——— بے کھال کا بکرا جس میں سے دھواں اٹھتا ہے؛ سردیوں کا ایک دن کہ بادل گھرے ہوئے ہیں اور آدمی سردی کے باوجود ایک میٹھی میٹھی حرارت محسوس کرتا ہے؛ ہانڈی جس میں سے بھاپ اٹھ رہی ہے؛ بہن جس کی ٹانگیں وہ دباتا ہے: یہ سب عناصر مل کر مسعود کے بدن میں جنسی بیداری پیدا کرتے ہیں۔ جوانی کی اس پہلی انگڑائی کو وہ غریب سمجھ نہیں سکتا اور انجام کار اپنی ہاکی اسٹک توڑنے کی ناکام سعی کرتا کرتا تھک جاتا ہے۔ یہ تھکاوٹ اس بے نام سی چنگاری کو، اس "کچھ ہونے" کی تحریک کو دبا دیتی ہے۔

"دھواں" میں شروع سے لے کر آخر تک ایک کیفیت، ایک جذبے، ایک تحریک کا نہایت ہی ہموار نفسیاتی بیان ہے۔ اصل موضوع سے ہٹ کر اس میں دور از کار باتیں نہیں کی گئی ہیں۔ اس میں ہمیں کہیں بھی ایسی ترغیب نظر نہیں آتی جو قارئین کو شہوانی لذتوں کے دائرے میں لے جائے، اس لیے کہ افسانے

کا موضوع شہوت نہیں ہے۔ استغاثہ اگر ایسا سمجھتا ہے تو یہ اس کی کم نظری ہے ——— خشخاش کے دانے افیم کی گولی بننے تک کافی مراحل طے کرتے ہیں۔

میں نے اس کہانی میں کوئی سبق نہیں دیا، اخلاقیات پر یہ کوئی لکچر بھی نہیں کیونکہ میں خود کو نام نہاد ناصح یا معلمِ اخلاق نہیں سمجھتا۔

انسان اپنے اندر کوئی برائی لے کر پیدا نہیں ہوتا۔ خوبیاں اور برائیاں اس کے دل و دماغ میں باہر سے داخل ہوتی ہیں۔ بعض ان کی پرورش کرتے ہیں، بعض نہیں کرتے ——— میرے نزدیک قصائیوں کی دکانیں فحش ہیں کیونکہ ان میں ننگے گوشت کی بہت بھدّا اور کھلے طور پر نمائش کی جاتی ہے۔ میرے نزدیک وہ ماں باپ اپنی اولاد کو جنسی بیداری کا موقعہ دیتے ہیں جو دن کو بند کمروں میں کئی کئی گھنٹے اپنی بیوی سے سر دبوانے کا بہانہ لگا کر اس سے ہم بستری کرتے ہیں ——— میں سمجھتا ہوں کہ اس لڑکے کو (یعنی مسعود کو) مضطرب کرنے والی چیزیں خارجی تھیں۔

ہندوستان میں بچوں کے اندر بہت کمسنی ہی میں جنسی بیداری پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ کسی حد تک آپ کو میرے افسانے کے مطالعے سے معلوم ہو سکتی ہے ——— اتنی چھوٹی عمر میں جنسی بیداری کا پیدا ہونا میرے نزدیک بہت ہی بھونڈی چیز ہے، یعنی اگر میں کسی چھوٹے بچے کو جنسیات کی طرف راغب دیکھوں تو مجھے کوفت ہوگی، میرے صناعانہ جذبات کو صدمہ پہنچے گا۔

افسانہ نگار اس وقت اپنا قلم اٹھاتا ہے جب اس کے جذبات کو صدمہ پہنچتا ہے۔ مجھے یاد نہیں کیونکہ بہت عرصہ گزر چکا ہے لیکن "دھواں" لکھنے سے پہلے مجھے کوئی منظر، کوئی اشارہ یا کوئی واقعہ دیکھ کر ضرور ایسا صدمہ پہنچا ہوگا جو افسانہ نگار کے قلم کو حرکت بخشتا ہے۔

افسانے کا مطالعہ کرنے سے یہ امر اچھی طرح واضح ہو سکتا ہے کہ میں نے اس بے نام سی لذت میں جو مسعود کو محسوس ہو رہی تھی، خود کو یا قارئین کو کہیں شریک نہیں کیا ہے۔ یہ ایک اچھے فن کار کی خوبی ہے۔

میں اس افسانے میں سے چند سطور پیش کرتا ہوں جن سے افسانہ نگار کے غایت درجہ محتاط ہونے کا پتہ چلتا ہے کہ اس نے کہیں بھی مسعود کے دماغ میں شہوانی خیالات کی موجودگی کا ذکر نہیں کیا ہے ——— ایسی لغزش افسانے کا ستیاناس کر دیتی۔

ایک : مسعود کے وزن کے نیچے کلثوم کی چوڑی چکلی کمر میں خفیف سا جھکاؤ پیدا ہوا جب اس نے پیروں سے دبانا شروع کیا، ٹھیک اسی طرح جس طرح مزدور مٹی گوندھتے ہیں تو کلثوم نے مزا لینے کی خاطر ہائے ہائے کرنا شروع کر دیا۔

دو : کلثوم کی رانوں میں اکڑی ہوئی مچھلیاں اس کے پیروں کے نیچے دب دب کر ادھر ادھر پھسلنے لگیں۔ مسعود نے ایک بار اسکول میں رسّے پر چلتے ہوئے ایک بازیگر کو دیکھا تھا، اس نے سوچا کہ بازیگر کے پیروں کے نیچے تنا ہوا رسّا بھی اسی طرح پھسلتا ہوگا۔

تین : بکرے کے گرم گرم گوشت کا اسے بار بار خیال آتا تھا۔ ایک دو مرتبہ اس نے سوچا: "کلثوم کو اگر ذبح کیا جائے تو کھال اترنے پر کیا اس کے گوشت میں سے دھواں نکلے گا؟" لیکن ایسی بیہودہ باتیں سوچنے پر اس نے اپنے آپ کو مجرم محسوس کیا اور دماغ کو اسی طرح صاف کیا جس طرح وہ سلیٹ کو اسفنج سے صاف کیا کرتا تھا۔

(عربی رسم الخط میں لکھے گئے) الفاظ اس بات کے ضامن ہیں کہ مسعود کا ذہن کہیں بھی شہوت سے ملوث نہیں ہوا۔ وہ اپنی بہن کی کمر دباتا ہے جس طرح مزدور مٹی گوندھتے ہیں! ٹانگیں دباتا ہے تو اس کا خیال بازیگر کی طرف چلا جاتا ہے جس کا تماشا اس نے ایک بار اپنے اسکول میں دیکھا تھا! اور جب وہ یہ سوچتا ہے کہ اس کی بہن ذبح کر دی جائے تو کیا اس کے گوشت میں سے دھواں نکلے گا تو فوراً اسے بُری بات سمجھ کر اپنے دماغ سے نکال دیتا ہے اور خود کو مجرم سمجھتا ہے ——— خدا جانے استغاثہ اس افسانے کو فحش کیوں کہتا ہے جس افسانے میں فحاشی کا شائبہ تک موجود نہیں۔

اگر میں کسی عورت کے سینے کا ذکر کرنا چاہوں گا تو اسے عورت کا سینہ ہی کہوں گا۔ عورت کی چھاتیوں کو آپ مونگ پھلی، میز یا استرہ نہیں کہہ سکتے ——— یوں تو بعض حضرات کے نزدیک عورت کا وجود ہی فحش ہے مگر اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے۔ میں ایسے لوگوں کو بھی جانتا ہوں جن کو بکری کا ایک معصوم بچہ ہی معصیت کی طرف لے جاتا ہے۔ دُنیا میں ایسے اشخاص بھی موجود ہیں جو مقدس کتابوں سے شہوانی لذت حاصل کرتے ہیں، اور ایسے انسان بھی آپ کو مل جائیں گے، لوہے کی مشینیں جن کے جسم میں شہوت کی حرارت پیدا کر دیتی ہیں ——— لوہے کی ان مشینوں کا جیسا کہ آپ سمجھ سکتے ہیں، کوئی قصور نہیں۔ اسی طرح نہ بکری کے معصوم بچے کا اور نہ مقدس کتابوں کا۔

ایک مریض جسم، ایک بیمار ذہن ہی ایسا غلط اثر لے سکتا ہے۔ جو لوگ روحانی، ذہنی اور جسمانی لحاظ سے تندرست ہیں، اصل میں انہی کے لیے شاعر شعر کہتا ہے، افسانہ نگار افسانہ لکھتا ہے اور مصوّر تصویر بناتا ہے۔

میرے افسانے تندرست اور صحت مند لوگوں کے لیے ہیں، نارمل انسانوں کے لیے جو عورت کے سینے کو عورت کا سینہ ہی سمجھتے ہیں اور اس سے زیادہ آگے نہیں بڑھتے۔ جو عورت اور مرد کے رشتے کو استعجاب کی نظر سے نہیں دیکھتے، جو کسی ادب پارے کو ایک ہی دفعہ نگل نہیں جاتے . . .

. . روٹی کھانے کے متعلق ایک موٹا سا اصول ہے کہ ہر لقمہ اچھی طرح چبا کر کھاؤ، لعابِ دہن میں اسے خوب حل ہونے دو تاکہ معدے پر زیادہ بوجھ نہ پڑے اور اس کی غذائیت برقرار رہے ——— پڑھنے کے لیے بھی یہی موٹا اصول ہے کہ ہر لفظ کو، ہر سطر کو، ہر خیال کو اچھی طرح ذہن میں چباؤ۔ اس لعاب کو جو پڑھنے سے تمہارے دماغ میں پیدا ہوگا، اچھی طرح حل کرو کہ جو کچھ تم نے پڑھا ہے، اچھی طرح ہضم ہو سکے۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کے نتائج بُرے ہوں گے جس کے لیے تم لکھنے والے کو ذمہ دار نہ ٹھہرا سکو گے ——— وہ روٹی جو اچھی طرح چبا کر نہیں کھائی گئی، وہ تمہاری بدہضمی کی ذمہ دار کیسے ہو سکتی ہے۔

میں ایک مثال سے اس کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔

فرانس میں ایک بہت بڑا افسانہ نگار گائی دی موپاساں گزرا ہے۔ جنسیات اس کا محبوب موضوع تھا۔ بڑے بڑے ڈاکٹروں اور ماہرینِ نفسیات نے اس کے افسانوں کا اپنی علمی کتابوں میں حوالہ دیا ہے ——— اپنے ایک افسانے میں وہ ایک لڑکے اور ایک لڑکی کی داستان بیان کرتا ہے جو بے حد الھڑ تھے۔ پہلی رات کے متعلق دونوں نے سُنی سُنائی باتوں سے ایک عجیب و غریب تصویر اپنے ذہن میں کھینچ رکھی تھی۔ دونوں اس خیال سے کانپ رہے تھے کہ خدا معلوم کتنی بڑی لذت ان کو پہلی رات کے ملاپ سے ملے گی ——— دونوں کی شادی ہوگئی۔ دولہا ماہِ عسل منانے کی خاطر دُلہن کو ایک ہوٹل میں لے گیا۔ وہاں پہلی رات کو، اس رات کو جس میں دونوں کے خیال کے مطابق شاید فرشتے اُتر کر ان کو لوریاں دینے والے تھے، دولہا اور دُلہن ہم بستر ہوگئے۔ دونوں لیٹے

تھے اور بس۔ دلہن نے شامتِ اعمال سے اتنا کہہ دیا: "بس، کیا یہی ہماری پہلی رات تھی جس کے ہم دونوں اتنے شیریں خواب دیکھا کرتے تھے ..." دولہا کو یہ بات کھا گئی۔ آخر مرد ہی تو تھا۔ اس نے سوچا، یہ میری مردانگی پر حملہ ہے، چنانچہ اس کی مردانگی بالکل ہی ختم ہوگئی۔ عرقِ ندامت میں غرق وہ حجرۂ عروسی سے باہر نکل گیا، اس غرض سے کہ اپنی ناکام زندگی کسی دریا کے سپرد کر دے۔ عین اس وقت جب یہ نیا نویلا دولہا اس خطرناک فیصلے پر پہنچا، فرانس کی ایک کسبی، ایک ویشیا اس کے پاس سے گزری۔ وہ غالباً گاہک تلاش کر رہی تھی۔ اس عصمت باختہ عورت نے اس کو اشارہ کیا۔ دولہا نے محض انتقام لینے کے لیے، ساری عورت ذات سے بدلہ لینے کے لیے ویشیا کے اشارے کا جواب دیا کہ ہاں میں تیار ہوں —— وہ مکھیائی اسے اپنے گھر لے گئی۔ اس کے غلیظ گھر میں دولہا وہ کام کرنے میں کامیاب ہوگیا جو وہ اپنے نفیس ہوٹل کے حجرۂ عروسی میں نہ کر سکا تھا —— اب وہ ویشیا کو بھول گیا۔ دوڑا دوڑا اپنی نئی بیاہتا بیوی کے پاس پہنچا جیسے اسے اپنی کھوئی ہوئی دولت مل گئی ہے —— دونوں پاس پاس لیٹے تھے مگر اب اس کی بیوی کو وہ شیریں خواب دیکھنے کی خواہش باقی نہیں رہی تھی جس کا اس نے پہلے گلہ کیا تھا۔

یہ افسانہ پڑھ کر اگر کوئی شخص جو پہلی رات کو ناکام رہا ہو، سیدھا ویشیا کے کوٹھے کا رُخ کرے گا تو میں سمجھتا ہوں، اس جیسا چغد اور کوئی نہیں ہوگا —— میرے ایک دوست نے یہی بیوقوفی کی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسے اپنا کھویا ہوا وقار تو مل گیا، پر اس کے ساتھ ایک مکروہ مرض چمٹ گیا جس کے علاج کے لیے اسے کافی سے زیادہ زحمت اُٹھانا پڑی۔

پچھلے دنوں میں نے آل انڈیا ریڈیو، بمبئی سے ایک تقریر نشر کی تھی۔ اس تقریر میں میں نے کہا تھا:

ادب ایک فرد کی اپنی زندگی کی تصویر نہیں۔ جب کوئی ادیب قلم اُٹھاتا ہے تو وہ اپنے گھریلو معاملات کا روزنامچہ پیش نہیں کرتا۔ وہ اپنی ذاتی خواہشوں، خوشیوں، رنجشوں، بیماریوں اور تندرستیوں کا ذکر نہیں کرتا —— اس کی قلمی تصویروں میں، بہت ممکن ہے، آنسو اس کی دُکھی بہن کے ہوں، مسکراہٹیں آپ کی ہوں اور قہقہے ایک خستہ حال مزدور کے۔

اس لیے اپنی مسکراہٹوں، اپنے آنسوؤں اور اپنے قہقہوں کی ترازو میں ان تصویروں کو تولنا بہت بڑی غلطی ہے۔

ہر ادب پارہ ایک خاص فضا، ایک خاص اثر، ایک خاص مقصد کے لیے پیدا ہوتا ہے۔ اگر اس میں یہ خاص فضا، یہ خاص اثر، یہ خاص مقصد محسوس نہ کیا جائے تو بس ایک بے جان لاش رہ جائے گی۔

میں ایک زمانے سے لکھ رہا ہوں۔ گیارہ کتابوں کا مصنف و مؤلف ہوں۔ آل انڈیا ریڈیو کے تقریباً ہر اسٹیشن سے میرے ڈرامے اور فیچر براڈکاسٹ ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی تعداد سو سے اوپر ہے۔

میں تحریر و تصنیف کے جملہ آداب سے واقف ہوں۔ میرے قلم سے بے ادبی شاذ و نادر ہی ہو سکتی ہے ——— میں فحش نگار نہیں، افسانہ نگار ہوں۔

دوسرے افسانے "کالی شلوار" کے متعلق میں نے اس لیے کچھ نہیں کہا ہے کہ یہ لاہور کی سیشن کورٹ میں فحاشی سے بری قرار دیا جا چکا ہے۔

میرے اس بیان کا کچھ اثر نہ ہوا۔

صفائی کے گواہوں میں ڈاکٹر سعید اللہ، ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔، پی۔ ایچ ڈی۔، ڈی۔ ایس۔ سی، پروفیسر کنہیا لال کپور، ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔، ڈاکٹر آئی۔ لطیف، ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ ڈی۔، مولانا باری علیگ، دیوندر ستیارتھی جیسی اہل الرائے ہستیاں موجود تھیں —— ان حضرات نے اپنا قیمتی وقت ضائع کر کے، سارا سارا دن عدالت میں گزار کر، میرے حق میں گواہی دی اور کہا کہ زیرِ عتاب افسانوں میں فحاشی کا شائبہ بھی موجود نہیں، لیکن رائے صاحب لالہ سنت رام نے دونوں افسانے فحش قرار دیے اور مجھے دو سو روپیہ جرمانہ ادا کرنے کی سزا دی (عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں کتنے مہینوں کی قیدِ با مشقت تھی، تھی یا نہیں، اس کا مجھے علم نہیں)۔

میں نے جب اپنی جیب سے دو سو روپے نکالے تو اسپیشل مجسٹریٹ صاحب کے ہونٹوں پر ایک اسپیشل مسکراہٹ نمودار ہوئی —— آپ نے کہا: ”ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کیل کانٹے سے لیس ہو کر آئے ہیں۔۔۔“

باوجود کوشش کے میرے ہونٹوں پر اسپیشل مسکراہٹ پیدا نہ ہو سکی۔

سیشن میں اپیل کی گئی۔

پیروی مسٹر ہیرالال سیبل نے کی۔

کئی مہینے گزرنے پر ایک روز ان کا تار آیا کہ ”مبارک ہو، سیشن کورٹ نے اپیل منظور کر لی ہے جرمانہ واپس ہو جائے گا۔“

تیسری دفعہ انجام بخیر ہوا۔

ایک اور لطیفہ:

چند روز ہوئے، ایک صاحب مجھ سے ملنے آئے۔
میں نے نوکر سے کہا: "پوچھو، کون ہے؟"
(نوکر نے) جواب دیا: "سی۔آئی۔ڈی۔ کا آدمی ہے..."
ظاہر ہے، میں نے سوچا، لاہور سے گرفتاری کا وارنٹ ہے، لیکن جب میں اس سی۔آئی۔ڈی۔ کے آدمی سے ملا اور اس سے پوچھا: "فرمائیے، اب کی بار میری کس کہانی پر عتاب نازل ہوا ہے..." تو وہ جیسے کچھ سمجھا ہی نہیں۔
وہ کہنے لگا: "ادھر ہم تپاس کرنے آیا ہے... تمھارا نام ادھر کمیونسٹ پارٹی کے آفس میں چوپڑی میں لکھا ہے... بولو، تمھارا کیا تعلق ہے اس سے..."
یہ سن کر مجھے تسلی ہوئی ——— مجھے مذاق سوجھا: "چوپڑی سے یا کمیونسٹ پارٹی سے؟"
"کمیونسٹ پارٹی سے..."
میں نے کہا: "تعلق ہے مگر ناجائز تعلق ہے..."
"کیوں ہے..."
"... اس لیے کہ تمھاری حکومت یہی سمجھتی ہے، ورنہ تم یہاں تپاس کرنے کیوں آتے؟"

یہ قصہ بھی ختم ہوا۔

آخر میں میں ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں جنھوں نے لاہور کی ایسی عدالت میں جہاں شریف انسانوں کو بیٹھنے کے لیے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی بھی نہیں ملتی، گھنٹوں اپنا قیمتی وقت ضائع کر کے بھینسوں کے آگے بین بجائی...

سعادت حسن منٹو

بمبئی
۲۷ فروری، ۱۹۴۷ء

سفید جھوٹ
افسانہ نگار اور جنسی مسائل
کسوٹی
عصمت فروشی

○

دفاع

سفید جھوٹ

ماہوار رسالہ "ادبِ لطیف" لاہور کے سالنامہ ۱۹۴۲ء میں میرا ایک افسانہ بعنوان "کالی شلوار" شایع ہوا تھا جسے لوگ فحش سمجھتے ہیں۔ یہ سفید جھوٹ ہے۔

افسانہ نگاری میرا پیشہ ہے۔ میں اس کے تمام آداب سے واقف ہوں۔ اس سے پیشتر اسی موضوع پر میں کئی افسانے لکھ چکا ہوں۔ ان میں سے کوئی بھی افسانہ فحش نہیں۔ میں آئندہ بھی اس موضوع پر افسانے لکھوں گا جو فحش نہیں ہوں گے۔

قصّہ گوئی ہبوطِ آدم سے جاری ہے اور میرا خیال ہے، قیامت تک جاری رہے گی۔ اس کی شکلیں بدلتی جائیں گی لیکن انسان اپنے احساسات دوسروں کے اذہان تک پہنچانے کا سلسلہ جاری رکھے گا۔

بیسواؤں پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت کچھ لکھا جائے گا۔ ہر اس شے کے متعلق لکھا یا کہا جاتا ہے جو سامنے موجود ہو۔ بیسوائیں اب سے نہیں، ہزارہا سال سے ہمارے درمیان موجود ہیں۔ ان کا تذکرہ الہامی کتابوں میں بھی موجود ہے۔ اب چونکہ کسی الہامی کتاب یا کسی پیغمبر کی گنجایش نہیں رہی، اس لیے موجودہ زمانے میں ان کا ذکر آپ آیات میں نہیں بلکہ ان اخباروں، رسالوں یا کتابوں میں دیکھتے ہیں جنھیں آپ عود اور لوبان جلائے بغیر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھنے کے بعد ردّی میں بھی اٹھوا سکتے ہیں۔

میں ایک ایسا انسان ہوں جو ایسے رسالوں اور ایسی کتابوں میں لکھتا ہے اور اس لیے لکھتا ہے کہ اسے کچھ کہنا ہوتا ہے۔ میں جو کچھ دیکھتا ہوں، جس نظر اور جس زاویے سے دیکھتا ہوں، وہی نظر، وہی زاویہ میں دوسروں کے سامنے پیش کر دیتا ہوں۔ اگر تمام لکھنے والے پاگل تھے تو آپ میرا شمار بھی ان پاگلوں میں کر سکتے ہیں۔

"کالی شلوار" کا پس منظر ایک ویشیا کا گھر ہے۔ یہ گھر بیّے کے گھر کی طرح حیرت انگیز نہیں جس کے متعلق عجیب و غریب باتیں مشہور ہیں۔ دلّی میں ایسی عورتوں کے لیے ایک مقام منتخب کر کے بے شمار گھر بنائے گئے ہیں۔ میری سلطانہ ایسے ہی ایک بنے بنائے گھر میں رہتی تھی۔ اس نے بیّے کی طرح یہ گھر خود نہیں بنایا تھا۔ وہ بیّے کی طرح رات کو جگنو پکڑ پکڑ کر اپنا گھر روشن نہیں کرتی۔ روشنی پیدا کرنے کے لیے بجلی موجود تھی اور چونکہ یہ بجلی مفت نہیں مل سکتی اور نہ رہنے کے لیے مکان ہی کرایے کے بغیر مل سکتا ہے، اس لیے اسے مزدوری کرنا پڑتی تھی۔ وہ اگر بیا ری ہوتی تو اسے یہ سب چیزیں مفت مل جاتیں لیکن

وہ بیاہی نہیں تھی، محض ایک عورت تھی اور جب عورت کو بجلی کے پیسے دینے پڑیں، گھر کا کرایہ ادا کرنا پڑے اور جس کے پلّے خدا بخش سا آدمی پڑ جائے جو فقیروں کے پیچھے مارا مارا پھرے تو ظاہر ہے کہ وہ ایسی عورت نہیں ہوگی جو ہم اپنے گھروں میں دیکھتے ہیں۔

میری سلطانہ چکلے کی ایک عورت ہے۔ اس کا پیشہ وہی ہے جو چکلے کی عورتوں کا ہوتا ہے۔ چکلے کی عورتوں کو کون نہیں جانتا۔ قریب قریب ہر شہر میں ایک چکلا موجود ہے —— بدرو اور موری کو کون نہیں جانتا۔ ہر شہر میں بدروئیں اور موریاں موجود ہیں جو شہر کی گندگی باہر لے جاتی ہیں —— ہم اگر اپنے مرمریں غسل خانوں کی باتیں کر سکتے ہیں، اگر ہم صابن اور لیونڈر کا ذکر کر سکتے ہیں تو ان موریوں اور بدروؤں کا ذکر کیوں نہیں کر سکتے جو ہمارے بدن کا میل پیتی ہیں۔ اگر ہم مندروں اور مسجدوں کا ذکر کر سکتے ہیں تو ان قحبہ خانوں کا ذکر کیوں نہیں کر سکتے جہاں سے لوٹ کر کئی انسان مندروں اور مسجدوں کا رخ کرتے ہیں۔ اگر ہم افیون، بھنگ، چرس اور شراب کے ٹھیکوں کا ذکر کر سکتے ہیں تو ان کوٹھوں کا ذکر کیوں نہیں کر سکتے جہاں ہر قسم کا نشہ استعمال کیا جاتا ہے۔

بھنگیوں سے چھوت چھات کی جاتی ہے۔ اگر کوئی بھنگی ہمارے گھر سے گندگی کا ٹوکرا اٹھا کر باہر نکلے تو ہم اپنی ناک پر رومال ضرور رکھ لیں گے۔ ہمیں گھن بھی آئے گی مگر ہم بھنگیوں کے وجود سے تو منکر نہیں ہو سکتے۔ اس فضلے سے تو انکار نہیں کر سکتے جو ہر روز ہمارے جسم سے خارج ہوتا ہے۔ قبض، پیچش، اسہال وغیرہ دور کرنے کے لیے دوائیں اسی لیے موجود ہیں کہ ہمارے جسم سے فاسد مادے کا اخراج ضروری ہے۔

گندگی کے نکاس کے لیے نت نئے طریقے سوچے جاتے ہیں، اس لیے کہ گندگی ہر روز جمع ہوتی جاتی ہے۔ اگر ہمارے جسم میں ایک انقلاب برپا ہو جائے اور اس کے افعال بدل جائیں۔ تو ہم قبض، پیچش اور اسہال کی باتیں نہیں کریں گے یا اگر گندگی کے نکاس کے لیے کوئی میکانکی طریقہ ایجاد ہو جائے تو بھنگیوں کا وجود باقی نہیں رہے گا۔

ہم اگر بھنگیوں کے متعلق بات کریں گے تو یقیناً کوڑے کرکٹ اور گندگی کا ذکر آئے گا۔ اگر ہم ویشیاؤں کے متعلق بات کریں گے تو یقیناً ان کے پیشے کا ذکر آئے گا۔

ویشیا کے کوٹھے پر ہم نماز یا درود پڑھنے نہیں جاتے۔ وہاں ہم جس غرض سے جاتے ہیں، ظاہر ہے، وہاں ہم اس لیے جاتے ہیں کہ وہاں ہم جا سکتے ہیں۔ وہاں جا کر ہم اپنی مطلوبہ جنس بے روک ٹوک خرید سکتے ہیں۔ جب وہاں جانے کی ہمیں کھلی اجازت ہے، جب ہر عورت اپنی مرضی پر ویشیا بن سکتی ہے اور ایک لائسنس لے کر جسم فروشی کر سکتی ہے، جب یہ تجارت قانوناً جائز تسلیم کی جاتی ہے تو اس کے متعلق ہم کیوں بات چیت نہیں کر سکتے؟

اگر ویشیا کا ذکر فحش ہے تو اس کا وجود بھی فحش ہے۔ اگر اس کا ذکر ممنوع ہے تو اس کا پیشہ بھی ممنوع ہونا چاہیے۔ ویشیا کو مٹائیے، اس کا ذکر خود بخود مٹ جائے گا۔

ہم وکیلوں کے متعلق کھلے بندوں باتیں کر سکتے ہیں۔ ہم نائیوں، دھوبیوں، کنجڑوں اور بھٹیاروں کے متعلق بات چیت کر سکتے ہیں۔ ہم چوروں، اچکوں، ٹھگوں اور راہزنوں کے قصے سنا سکتے ہیں۔ ہم جنوں اور پریوں کی داستانیں بیٹھے گھڑ سکتے ہیں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب آسمان کی طرف شیطان بڑھنے لگتا ہے تو فرشتے تارے توڑ توڑ کر اسے مارتے ہیں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک بیل اپنے سینگوں پر ساری دنیا اٹھائے ہوئے ہے۔ ہم داستانِ امیر حمزہ اور قصہ طوطا مینا تصنیف کر سکتے ہیں۔ ہم لندھور پہلوان کے گرز کی تعریف

کر سکتے ہیں۔ ہم عمرو عیار کی ٹوپی اور زنبیل کی باتیں کر سکتے ہیں۔ ہم ان طوطوں اور میناؤں کے قصے سنا سکتے ہیں جو ہر زبان میں باتیں کرتے تھے۔ ہم جادوگروں کے منتروں اور ان کے توڑ کی باتیں کر سکتے ہیں۔ ہم عمل ہمزاد اور کیمیا گری کے متعلق جو من میں آئے، کہہ سکتے ہیں۔ ہم داڑھیوں، پائجاموں اور سر کے بالوں کی لمبائی پر لڑ جھگڑ سکتے ہیں۔ ہم روغن جوش، پلاؤ اور قورمہ بنانے کی نئی نئی ترکیبیں سوچ سکتے ہیں۔ ہم یہ سوچ سکتے ہیں کہ سبز رنگ کے کپڑے پر کس رنگ اور کس قسم کے بٹن سجیں گے —— ہم ویشیا کے متعلق کیوں نہیں سوچ سکتے۔ اس کے پیشے کے بارے میں کیوں غور نہیں کر سکتے۔ ان لوگوں کے متعلق کیوں کچھ نہیں کہہ سکتے جو اس کے پاس جاتے ہیں؟

ہم ایک نوجوان لڑکے اور ایک نوجوان لڑکی کا باہمی رشتہ معاشقہ کرا سکتے ہیں۔ ان کی پہلی ملاقات داتا گنج بخش کے مزار میں کرا سکتے ہیں۔ ایک دلال بڑھیا بیچ میں لا سکتے ہیں۔ جوان دو بچھڑی روحوں کو بار بار ملاتی رہے۔ ہم آخر میں ان کے عشق کو ناکام بنا سکتے ہیں۔ دونوں کو زہر پلوا سکتے ہیں۔ ان دونوں کے جنازے، ایک اس محلے سے اور ایک اس محلے سے نکلوا سکتے ہیں۔ پھر ان دونوں کی قبریں ایک معجزے کے ذریعے سے آپس میں ملوا سکتے ہیں اور اگر ضرورت محسوس ہو تو اوپر سے فرشتوں کے ہاتھوں سے پھولوں کی بارش بھی کرا سکتے ہیں —— ہم ویشیا کی زندگی کیوں بیان نہیں کر سکتے۔ اسے تو فرشتوں اور ان کے پھولوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ اگر مرتی ہے تو دوسرے محلے سے کوئی جنازہ اس کی موت کا ساتھ نہیں دیتا، کوئی قبر اس کی قبر سے ملنے کی خواہش نہیں کرتی۔

ویشیا کا مکان خود ایک جنازہ ہے جو سماج اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہے۔ وہ اسے جب تک کہیں دفن نہیں کرے گا، اس کے متعلق باتیں ہوتی ہی رہیں گی۔ یہ لاش گلی سڑی سہی، بدبودار سہی، متعفن سہی، بھیانک سہی، گھناؤنی سہی لیکن اس کا منہ دیکھنے میں کیا ہرج ہے۔ کیا یہ ہماری کچھ نہیں لگتی۔ کیا ہم اس کے عزیز و اقارب نہیں۔ ہم کبھی کبھی کفن ہٹا کر اس کا منہ دیکھتے رہیں گے اور دوسروں کو دکھاتے رہیں گے۔

میں نے "کالی شلوار" میں ایسی ہی ایک لاش کا منہ دکھایا ہے۔ ملاحظہ ہو:

سڑک کی دوسری طرف مال گودام تھا جو اس کونے سے اس کونے تک پھیلا ہوا تھا۔ داہنے ہاتھ کو لوہے کی چھت کے نیچے بڑی بڑی گانٹھیں پڑی رہتی تھیں اور ہر قسم کے مال اسباب کے ڈھیر لگے رہتے تھے۔ بائیں ہاتھ کو کھلا میدان تھا جس میں بے شمار ریل کی پٹریاں بچھی ہوئی تھیں۔ دھوپ میں لوہے کی یہ پٹریاں چمکتیں تو سلطانہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتی جن پر نیلی نیلی رگیں بالکل ان پٹریوں کی طرح ابھری رہتی تھیں۔ اس لمبے اور کھلے میدان میں ہر وقت انجن اور گاڑیاں چلتی رہتی تھیں۔ کبھی ادھر، کبھی ادھر۔ ان انجنوں اور گاڑیوں کی چھک چھک پھک پھک سدا گونجتی رہتی تھی۔ صبح سویرے جب وہ اٹھ کر بالکنی میں آتی تو ایک عجیب سماں اسے نظر آتا۔ دھند لکے میں انجنوں کے منہ سے گاڑھا گاڑھا دھواں نکلتا تھا اور گدلے آسمان کی جانب موٹے اور بھاری آدمیوں کی طرح اٹھتا دکھائی دیتا

تھا۔ بھاپ کے بڑے بڑے بادل بھی ایک شور کے ساتھ اٹھتے تھے اور آنکھ جھپکنے کی دیر میں ہوا کے اندر گھل مل جاتے تھے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ گاڑی کے کسی ڈبے کو جسے انجن نے دھکا دے کر چھوڑ دیا ہو، اکیلے پٹریوں پر چلتا دیکھتی تو اسے اپنا خیال آتا۔ وہ سوچتی کہ اسے بھی کسی نے زندگی کی پٹری پر دھکا دے کر چھوڑ دیا ہے اور وہ خود بخود جا رہی ہے۔ دوسرے لوگ کانٹے بدل رہے ہیں اور وہ چلی جا رہی ہے، جانے کہاں۔ پھر ایک روز ایسا آئے گا جب اس دھکے کا زور آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گا اور وہ کہیں رک جائے گی، کسی ایسے مقام پر جو اس کا دیکھا بھالا نہ ہوگا۔

ذہین پڑھنے والوں کے لیے اس سے اچھے اشارے اور کیا ہو سکتے ہیں۔ سلطانہ کی زندگی کا صحیح نقشہ ان اشاروں اور کنایوں سے میں نے پیش کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ دلی کی میونسپلٹی نے دہلی کی ویشیاؤں کے لیے ایک خاص جگہ مقرر کرتے وقت یہ نہ سوچا ہوگا کہ مال گودام ان کی زندگی کا صحیح نقشہ پیش کرتا ہے لیکن جو صاحب نظر ہیں وہ ان مکانوں اور مال گودام کو آمنے سامنے دیکھ کر "کالی شلوار" جیسے کئی افسانے لکھیں گے۔

اسی لاش کا ایک بار میں نے یوں بھی منہ دکھایا تھا۔ میں اپنے مشہور افسانے "ہتک" کا آغاز ان سطور سے کرتا ہوں:

دن بھر کی تھکی ماندی وہ ابھی ابھی اپنے بستر پر لیٹی تھی اور لیٹتے ہی سو گئی تھی۔ میونسپل کمیٹی کا داروغہ صفائی جسے وہ سیٹھ کے نام سے پکارتی تھی، ابھی ابھی اس کی ہڈی پسلیاں جھنجھوڑ کر شراب کے نشے میں چور، گھر واپس گیا تھا۔ وہ رات یہیں ٹھیرتا، پر اسے اپنی دھرم پتنی کا بہت خیال تھا جو اس سے بے حد پریم کرتی تھی۔

وہ روپے جو اس نے اپنی جسمانی مشقت کے بدلے اس داروغہ سے وصول کیے تھے، اس کی چست تھوک بھری چولی کے نیچے سے اوپر کو ابھرے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی سانس کے اتار چڑھاؤ سے چاندی کے یہ سکے کھنکھنانے لگتے اور ان کی کھنکھناہٹ اس کے دل کی غیر آہنگ دھڑکنوں میں گھل مل جاتی اور ایسا معلوم ہوتا کہ ان سکوں کی چاندی پگھل کر اس کے دل کے خون میں ٹپک رہی ہے۔

اس کا سینہ اندر سے تپ رہا تھا۔ یہ گرمی کچھ تو اس برانڈی کا باعث تھی جس کا ادھا داروغہ اپنے ساتھ لایا تھا اور کچھ اس "بیوڑا" کا نتیجہ تھی جس کو سوڈا ختم ہونے پر دونوں نے پانی ملا کر پیا تھا۔

وہ ساگوان کے لمبے چوڑے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹی تھی۔ اس کی باہیں جو کاندھوں تک ننگی تھیں، پتنگ کی اس کانپ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں جو اوس میں بھیگ جانے کے باعث پتلے کاغذ سے

کر سکتے ہیں۔ ہم عمرو عیار کی ٹوپی اور زنبیل کی باتیں کر سکتے ہیں۔ ہم ان طوطوں اور میناؤں کے قصے سنا سکتے ہیں جو ہر زبان میں باتیں کرتے تھے۔ ہم جادوگروں کے منتروں اور ان کے توڑ کی باتیں کر سکتے ہیں۔ ہم عمل ہمزاد اور کیمیا گری کے متعلق جو من میں آئے لکھ سکتے ہیں۔ ہم داڑھیوں، پائجاموں اور سر کے بالوں کی لمبائی پر لڑ جھگڑ سکتے ہیں۔ ہم روغن جوش، پلاؤ اور قورمہ بنانے کی نئی نئی ترکیبیں سوچ سکتے ہیں۔ ہم یہ سوچ سکتے ہیں کہ سبز رنگ کے کپڑے پر کس رنگ اور کس قسم کے بٹن سجیں گے —— ہم ویشیا کے متعلق کیوں نہیں سوچ سکتے۔ اس کے پیشے کے بارے میں کیوں غور نہیں کر سکتے۔ ان لوگوں کے متعلق کیوں کچھ نہیں کہہ سکتے جو اس کے پاس جاتے ہیں؟

ہم ایک نوجوان لڑکے اور ایک نوجوان لڑکی کا باہمی رشتہ معاشقہ کرا سکتے ہیں۔ ان کی پہلی ملاقات داتا گنج بخش کے مزار میں کرا سکتے ہیں۔ ایک دلال بڑھیا بیچ میں لا سکتے ہیں۔ جو ان دو بچھڑی روحوں کو بار بار ملاتی رہے۔ ہم آخر میں ان کے عشق کو ناکام بنا سکتے ہیں۔ دونوں کو زہر پلوا سکتے ہیں۔ ان دونوں کے جنازے، ایک اس محلے سے اور ایک اس محلے سے نکلوا سکتے ہیں۔ پھر ان دونوں کی قبریں ایک معجزے کے ذریعے سے آپس میں ملوا سکتے ہیں اور اگر ضرورت محسوس ہو تو اوپر سے فرشتوں کے ہاتھوں سے پھولوں کی بارش بھی کرا سکتے ہیں —— ہم ویشیا کی زندگی کیوں بیان نہیں کر سکتے۔ اسے تو فرشتوں اور ان کے پھولوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ اگر مرتی ہے تو دوسرے محلے سے کوئی جنازہ اس کی موت کا ساتھ نہیں دیتا، کوئی قبر اس کی قبر سے ملنے کی خواہش نہیں کرتی۔

ویشیا کا مکان خود ایک جنازہ ہے جو سماج اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہے۔ وہ اسے جب تک کہیں دفن نہیں کرے گا، اس کے متعلق باتیں ہوتی ہی رہیں گی۔ یہ لاش گلی سڑی سہی، بدبودار سہی، متعفن سہی، بھیانک سہی، گھناؤنی سہی لیکن اس کا منہ دیکھنے میں کیا ہرج ہے۔ کیا یہ ہماری کچھ نہیں لگتی۔ کیا ہم اس کے عزیز و اقارب نہیں۔ ہم کبھی کبھی کفن ہٹا کر اس کا منہ دیکھتے رہیں گے اور دوسروں کو دکھاتے رہیں گے۔

میں نے "کالی شلوار" میں ایسی ہی ایک لاش کا منہ دکھایا ہے۔ ملاحظہ ہو:

سڑک کی دوسری طرف مال گودام تھا جو اس کونے سے اس کونے تک پھیلا ہوا تھا۔ داہنے ہاتھ کو لوہے کی چھت کے نیچے بڑی بڑی گانٹھیں پڑی رہتی تھیں اور ہر قسم کے مال اسباب کے ڈھیر لگے رہتے تھے۔ بائیں ہاتھ کو کھلا میدان تھا جس میں بے شمار ریل کی پٹڑیاں بچھی ہوئی تھیں۔ دھوپ میں لوہے کی یہ پٹڑیاں چمکتیں تو سلطانہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتی جن پر نیلی نیلی رگیں بالکل ان پٹڑیوں کی طرح ابھری رہتی تھیں۔ اس لمبے اور کھلے میدان میں ہر وقت انجن اور گاڑیاں چلتی رہتی تھیں۔ کبھی ادھر، کبھی ادھر۔ ان انجنوں اور گاڑیوں کی چھک چھک پھک پھک سدا گونجتی رہتی تھی۔ صبح سویرے جب وہ اٹھ کر بالکنی میں آتی تو ایک عجیب سماں اسے نظر آتا۔ دھند لکے میں انجنوں کے منہ سے گاڑھا گاڑھا دھواں نکلتا تھا اور گدلے آسمان کی جانب موٹے اور بھاری آدمیوں کی طرح اٹھتا دکھائی دیتا!

تھا۔ بھاپ کے بڑے بڑے بادل بھی ایک شور کے ساتھ اُٹھتے تھے اور آنکھ جھپکنے کی دیر میں ہوا کے اندر گھل مل جاتے تھے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ گاڑی کے کسی ڈبے کو جسے انجن نے دھکا دے کر چھوڑ دیا ہو، اکیلے پٹڑیوں پر چلتا دیکھتی تو اسے اپنا خیال آتا۔ وہ سوچتی کہ اسے بھی کسی نے زندگی کی پٹڑی پر دھکا دے کر چھوڑ دیا ہے اور وہ خود بخود جا رہی ہے۔ دوسرے لوگ کانٹے بدل رہے ہیں اور وہ چلی جا رہی ہے، جانے کہاں پھر ایک روز ایسا آئے گا جب اس دھکے کا زور آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گا اور وہ کہیں رُک جائے گی، کسی ایسے مقام پر جو اس کا دیکھا بھالا نہ ہوگا۔

ذہین پڑھنے والوں کے لیے اس سے اچھے اشارے اور کیا ہو سکتے ہیں۔ سلطانہ کی زندگی کا صحیح نقشہ ان اشاروں اور کنایوں سے میں نے پیش کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ دہلی کی میونسپلٹی نے دہلی کی ویشیاؤں کے لیے ایک خاص جگہ مقرر کرتے وقت یہ نہ سوچا ہوگا کہ مال گودام ان کی زندگی کا صحیح نقشہ پیش کرتا ہے لیکن جو صاحب نظر ہیں، وہ ان مکانوں اور مال گودام کو آمنے سامنے دیکھ کر ”کالی شلوار“ جیسے کئی افسانے لکھیں گے۔

اسی لاش کا ایک بار میں نے یوں بھی منہ دکھایا تھا۔ میں اپنے مشہور افسانے ”ہتک“ کا آغاز ان سطور سے کرتا ہوں:

دن بھر کی تھکی ماندی وہ ابھی ابھی اپنے بستر پر لیٹی تھی اور لیٹتے ہی سو گئی تھی۔ میونسپل کمیٹی کا داروغہ صفائی جسے وہ سیٹھ کے نام سے پکارتی تھی، ابھی ابھی اس کی ہڈی پسلیاں جھنجھوڑ کر شراب کے نشے میں چور گھر واپس گیا تھا۔ وہ رات یہیں ٹھہر جاتا، پر اسے اپنی دھرم پتنی کا بہت خیال تھا جو اس سے بے حد پریم کرتی تھی۔

وہ روپے جو اس نے اپنی جسمانی مشقت کے بدلے اس داروغہ سے وصول کیے تھے، اس کی چست تھوک بھری چولی کے نیچے سے اوپر کو ابھرے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی سانس کے اتار چڑھاؤ سے چاندی کے یہ سکے کھنکھنانے لگتے اور ان کی کھنکھناہٹ اس کے دل کی غیر آہنگ دھڑکنوں میں گھل مل جاتی اور ایسا معلوم ہوتا کہ ان سکوں کی چاندی پگھل کر اس کے دل کے خون میں ٹپک رہی ہے۔

اس کا سینہ اندر سے تپ رہا تھا۔ یہ گرمی کچھ تو اس برانڈی کا باعث تھی جس کا ادھا داروغہ اپنے ساتھ لایا تھا اور کچھ اس ”بیوڑا“ کا نتیجہ تھی جس کو سوڈا ختم ہونے پر دونوں نے پانی ملا کر پیا تھا۔

وہ ساگوان کے لمبے چوڑے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹی تھی۔ اس کی باہیں جو کاندھوں تک ننگی تھیں، پتنگ کی اس کانپ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں جو رات اوس میں بھیگ جانے کے باعث پتلے کاغذ سے

پیدا ہو جائے۔ داہنی بازو کی بغل میں شکن آلود گوشت ابھرا ہوا تھا جو بار بار مونڈنے کے باعث سیاہی مائل رنگت اختیار کر گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نچی ہوئی مرغی کی کھال کا ایک ٹکڑا وہاں پر رکھ دیا گیا ہے۔

یہ سلطانہ کی ایک بہن سوگندھی کی تصویر ہے۔ اس کے پاس خدا بخش کے بجائے ایک خارش زدہ کتا تھا۔ خدا بخش سلطانہ کا دل نہ بہلا سکا مگر یہ خارش زدہ کتا سوگندھی کے بہت کام آیا۔ میں اس افسانے کے آخر میں لکھتا ہوں:

کتا اپنی ٹنڈ منڈ دم ہلاتا سوگندھی کے پاس واپس آیا اور اس کے قدموں کے پاس بیٹھ کر کان پھڑپھڑانے لگا۔ سوگندھی چونکی۔ اس نے اپنے چاروں طرف ایک ہولناک سناٹا دیکھا۔ ایسا سناٹا جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر شے خالی ہے جیسے مسافروں سے لدی ہوئی ریل گاڑی سب اسٹیشنوں پر مسافر اتار کر اب لوہے کے شیڈ میں بالکل اکیلی کھڑی ہے۔ یہ خلا جو اچانک سوگندھی کے اندر پیدا ہو گیا تھا، اسے بہت تکلیف دے رہا تھا۔ اس نے کافی دیر تک اس خلا کو بھرنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ وہ ایک ہی وقت میں بے شمار خیالات اپنے دماغ میں ٹھونستی تھی مگر بالکل چھلنی کا سا حساب تھا۔ ادھر وہ دماغ کو پُر کرتی تھی اور ادھر وہ خالی ہو جاتا تھا۔ بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی جب اس کو اپنا دل پرچانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اٹھایا اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اسے اپنے پہلو میں لٹا کر سو گئی۔

کون ہے جو یہ تصویریں دیکھ کر لذت حاصل کرنے کے واسطے ان ویشیاؤں کے کوٹھے پر جائے گا۔ میری سلطانہ اور میری سوگندھی تنہائی میں دیکھنے والی تصویریں نہیں ہیں جن کے اشتہار آئے دن اخباروں میں چھپتے رہتے ہیں۔ وہ کوئی نیا جوڑ دار آسن پیش نہیں کرتیں۔ وہ امساک کا کوئی خاندانی نسخہ نہیں بتاتیں۔ وہ کوئی چٹخارے دار آپ بیتی نہیں سناتیں کہ شہوانی جذبات ابھر آئیں۔

میرا زیر بحث افسانہ "کالی شلوار" اگر آپ غور سے پڑھیں تو ذیل کی باتیں آپ کے ذہن میں آئیں گی:

ایک: سلطانہ ایک معمولی ویشیا ہے۔ پہلے انبالے میں پیشہ کراتی تھی۔ بعد میں اپنے دوست خدا بخش کے کہنے پر دہلی چلی آئی۔ یہاں اس کا کاروبار نہ چلا۔

دو: خدا بخش خدا پر ناجائز بھروسہ کرنے اور فقیروں کی کرامات پر ایمان لانے والا آدمی تھا۔

تین: سلطانہ کا جب کاروبار نہ چلا تو وہ بہت افسردہ ہوئی۔ اس کی افسردگی میں اور اضافہ ہو گیا جب خدا بخش فقیروں کے پیچھے پیچھے مارا مارا پھرنے لگا۔

چار: محرم سر پر آ گیا۔ سلطانہ کی دوسری سہیلیوں نے کالے کپڑے بنوا لیے مگر وہ نہ بنوا سکی۔ اس

لیے کہ اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔
پانچ : اس موقع پر شنکر آتا ہے، ایک آوارہ گرد۔ ذہانت، حاضر جوابی اور خوش گفتاری کے علاوہ جس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ سلطانہ کے پاس آتا ہے اور اپنی ان خوبیوں کے معاوضے میں اس سے وہ جنس طلب کرتا ہے جسے وہ دام لے کر فروخت کرتی ہے۔ سلطانہ یہ سودا قبول نہیں کرتی۔
چھ : دوسری مرتبہ شنکر خود نہیں آتا بلکہ اُداس سلطانہ اسے خود بلاتی ہے اور اسے اپنے ٹھیرے پانی ایسی زندگی میں ایک حادثے کے طور پر قبول کر لیتی ہے۔ اس سے مل کر وہ خوش ہوتی ہے مگر یہ احساس اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا کہ محرم کے لیے اس کے پاس ایک کالی شلوار کی کمی ہے۔ وہ شنکر سے کہتی ہے: مُحرّم آرہا ہے، میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ میں کالی شلوار بنا سکوں۔ یہاں کے سارے دکھڑے تو تم مجھ سے سن ہی چکے ہو۔ قمیص اور دوپٹہ میرے پاس موجود تھا جو میں نے آج رنگوانے کے لیے دے دیا ہے۔
سات : شنکر محرم کی پہلی تاریخ کو ایک کالی شلوار سلطانہ کے لیے لے آتا ہے۔ خدا بخش کا خدا اور خدا رسیدہ بزرگوں پر غیر ضروری اعتقاد کام نہیں آتا لیکن شنکر کی ذہانت کام آجاتی ہے۔
یہ افسانہ پڑھ کر دل و دماغ پر کیا اثر ہوتا ہے؟ کیا اس کا پلاٹ یا اس کا اندازِ بیان لوگوں کو ویشیاؤں کی طرف کھینچتا ہے؟ میں اس کے جواب میں کہوں گا، ہرگز نہیں۔ اس لیے کہ یہ اس مقصد کے لیے نہیں لکھا گیا۔ اگر اس کو پڑھ کر ایسا اثر پیدا نہیں ہوتا تو یہ افسانہ اخلاقیت سے گرا ہوا نہیں ہے۔ اگر یہ اخلاقیت سے گرا ہوا نہیں تو یہ افسانہ ایسا گیت نہیں جسے حظ اٹھانے کی خاطر لوگ گائیں اور بار بار گائیں۔ کوئی گراموفون کمپنی اس کے ریکارڈ نہیں بھرے گی۔ اس لیے کہ اس میں جذبات ابھارنے والے دادرے اور ٹھمریاں نہیں ہیں۔
"کالی شلوار" جیسے افسانے تفریح کی خاطر نہیں لکھے جاتے۔ ان کو پڑھ کر شہوانی جذبات کی رال نہیں ٹپکنے لگتی۔ اس کو لکھ کر میں کسی شرمناک فعل کا مرتکب نہیں ہوا۔ مجھے فخر ہے کہ میں اس کا مصنف ہوں۔ میں شکر کرتا ہوں کہ میں نے کوئی ایسی مثنوی نہیں لکھی جس کے اشعار میں آپ کی خدمت میں نمونے کے طور پیش کرتا ہوں :

ہاتھا پائی سے ہانپتے جانا — کھلتے جانے میں ڈھانپتے جانا
وہ ترا منہ سے منہ بھڑا دینا — وہ ترا جیب کا لڑا دینا
وہ ترا پیار سے لپٹ جانا — اور دل کھول کے چمٹ جانا
ہولے ہولے پکارنے لگنا — ڈھیلے ہاتھوں سے مارنے لگنا
منہ سے کچھ کچھ پڑے بکے جانا — چھوٹ جانے کے گوں تکے جانا
تھک کے کہنا خدا کے واسطے چھوڑ — نیند آئی ہے اب مجھے نہ جھنجھوڑ
وہ ترا ڈھیلے چھوڑنا بے بس — وہ تیرا سست ہو کے کہنا بس
بات باقی نہیں رہی اب تو — رات باقی نہیں رہی اب تو
کہیں تیری یہ بات نبڑے گی — یا یونہی ساری رات نبڑے گی
مجھ میں باقی کچھ اب تو بات نہیں — صبح بھی ہو چکی ہے رات نہیں

دیکھ اب آگے مار بیٹھوں گی   یا کسو کو پکار بیٹھوں گی
آدمی کی جو رتیخ سے نکلے گی   منہ سے کیونکر نہ چیخ نکلے گی
کبھی پھر بھی تو کام ہووے گا   دیکھیو کون ساتھ سووے گا

اقتباسات از مثنوی میر درد مطبوعہ انجمن ترقی اردو

شکر ہے کہ میں نے اپنی پیاس اور بھوک کی خواہشاتِ نفسانی کو پرچانے کے لیے ایسے اشعار نہیں لکھے:

لب سے لب مرے ملائے رکھنا   بازو سے وہ سر اٹھائے رکھنا
وہ سینے پہ لیٹ کے ستانا   مطلب کے سخن پہ روٹھ جانا
وہ منہ میں زبان کی لذتیں ہائے   ظاہر حرکت سے رغبتیں ہائے
اپنا جو ہوا کچھ اور ارادہ   جی چاہا کہ اس سے بھی زیادہ
وہ ہاتھ کو رکھ کے جوشِ انکار   وا کرنے نہ دینا بندِ شلوار
وہ ہاتھ کو دم بہ دم جھٹکنا   وہ تکیے پر سر کو دے پٹکنا
آہستہ لگانی آہ لاہیں!   حیلہ کی وہ کیسی کیسی باتیں
وہ ہاتھ کو زور سے چھڑانا   وہ ہو کے تنک کاٹ کھانا
وہ نیچے پڑے ہی تلملانا   قابو سے تڑپ کے نکل جانا
وہ چیں بہ جبیں ہو کے کہنا   کن بیکسیوں سے رو کے کہنا
ہے تم کو یہی شغل دن رات   اچھی نہیں لگتی مجھ کو یہ بات
بھرتا ہی نہیں ہے تیرا جی بس   کرتا ہی نہیں ہے تو کبھی بس

کلیاتِ مومن: مثنوی دوئم: مطبوعہ نول کشور لکھنؤ۔

عورت اور مرد کے جنسی رشتے کے متعلق اگر اس انداز میں کچھ کہا جائے تو میں اسے معیوب سمجھوں گا۔ اس لیے کہ یہ ہر بالغ آدمی کو معلوم ہے۔ تنہائی میں جب مرد اور عورت ایک بستر پر اس غرض سے لیٹتے ہیں تو اسی قسم کی حیوانی حرکات کرتے ہیں لیکن وہ ایسی خوبصورت نہیں ہوتیں جیسا کہ ان اشعار میں ظاہر کی گئی ہیں۔ ان کی حیوانیت کو شاعری کے پردے میں چھپا دیا گیا ہے۔ یہ لکھنے والے کی شرارت ہے جو یقیناً قابلِ گرفت ہے۔ اگر مرد عورت کے اس حیوانی فعل کا فلم بنا کر پردے پر پیش کیا جائے تو مجھے یقین ہے کہ اس کو دیکھ کر تمام سلیم الدماغ آدمی نفرت سے منہ پھیر لیں گے لیکن جو اشعار میں نے اوپر نمونے کے طور پر پیش کیے ہیں، وہ اس حیوانی فعل کی غلط تصویر پیش کرتے ہیں۔

ایسی شاعری "دماغی جلق" ہے، لکھنے اور پڑھنے والوں دونوں کے لیے میں اسے مضر سمجھتا ہوں۔

——— میرے افسانے "کالی شلوار" میں ایسا کوئی عیب نہیں۔ میں نے اس میں کہیں بھی مرد اور عورت کے جنسی ملاپ کو لذیذ انداز میں بیان نہیں کیا۔ میری سلطانہ سے جو اپنے گاہک گوروں کو اپنی زبان میں گالیاں دیا کرتی تھی اور ان کو الو کے پٹھے سمجھتی تھی، کس قسم کی لذت یا کس قسم کے حظ کی توقع کی جا سکتی ہے۔ وہ ایک دکاندار تھی، ٹھیٹ قسم کی دکاندار۔ اگر ہم شراب کی دکان پر شراب کی بوتل لینے جائیں تو یہ توقع نہیں کریں

گے کہ وہ عمر خیام بنا بیٹھا ہوگا یا اس کو حافظ کا سارا دیوان ازبر یاد ہوگا۔ شراب کے ٹھیکے دار شراب بیچتے ہیں، عمر خیام کی رباعیاں اور حافظ شیرازی کے شعر نہیں بیچتے —— میری سلطانہ عورت بعد میں ہے، ویشیا سب سے پہلے ہے کیونکہ انسان کی زندگی میں اس کا پیٹ سب سے زیادہ اہم ہے۔ شنکر اس سے پوچھتا ہے: تُم بھی کُچھ نہ کُچھ ضرور کرتی ہوگی؟

سلطانہ جواب دیتی ہے: جھک مارتی ہوں . . . وہ یہ نہیں کہتی کہ مَیں گندم کا بیوپار کرتی ہوں یا سونے چاندی کی تجارت کرتی ہوں۔ اسے معلوم ہے کہ وہ کیا کرتی ہے۔ اگر کسی ٹائپسٹ سے پوچھا جائے کہ تم کیا کام کرتے ہو تو وہ یہی جواب دے گا: "ٹائپ کرتا ہوں"

میری سلطانہ اور ایک ٹائپسٹ میں کیا فرق ہے، ذرا غور کیجیے۔

افسانہ نگار اور جنسی مسائل

کوئی حقیر سے حقیر چیز ہی کیوں نہ ہو، مسائل پیدا کرنے کا باعث ہو سکتی ہے ——— مسہری کے اندر ایک مچھر گھس آئے تو اس کو باہر نکالنے، مارنے اور آئندہ کے لیے دوسرے مچھروں کی روک تھام کرنے کے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں ——— لیکن دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ یعنی تمام مسئلوں کا باپ اس وقت پیدا ہوا تھا، جب آدم نے بھوک محسوس کی تھی اور اس سے چھوٹا مگر دلچسپ مسئلہ اس وقت پردۂ ظہور پر آیا تھا جب دُنیا کے اس سب سے پہلے مرد کی دُنیا کی سب سے پہلی عورت سے ملاقات ہوئی تھی۔

یہ دونوں مسئلے جیسا کہ آپ جانتے ہیں، دو مختلف قسم کی بھوکیں ہیں جن کا آپس میں بہت گہرا تعلق ہے ——— یہی وجہ ہے کہ ہمیں اس وقت جتنے معاشرتی، مجلسی، سیاسی اور جنگی مسائل نظر آتے ہیں، ان کے عقب میں یہی دو بھوکیں جلوہ گر ہیں۔

موجودہ جنگ کا خونیں پردہ اگر اُٹھا دیا جائے تو لاشوں کے انبار کے پیچھے آپ کو ملک گیری کی بھوک کے سوا اور کچھ نظر نہیں آئے گا۔

بھوک کسی قسم کی بھی ہو بہت خطرناک ہے ——— آزادی کے بھوکوں کو اگر غلامی کی زنجیریں ہی پیش کی جاتی رہیں تو انقلاب ضرور برپا ہو گا۔ روٹی کے بھوکے اگر فاقے ہی کھینچتے رہے تو وہ تنگ آ کر دوسرے کا نوالہ ضرور چھینیں گے۔ مرد کی نظروں کو اگر عورت کے دیدار کا بھوکا رکھا گیا تو شاید وہ اپنے ہم جنسوں اور حیوانوں ہی میں اس کا عکس دیکھنے کی کوشش کرے۔

دُنیا میں جتنی لعنتیں ہیں، بھوک ان کی ماں ہے ——— بھوک گداگری سکھاتی ہے، بھوک جرائم کی ترغیب دیتی ہے، بھوک عصمت فروشی پر مجبور کرتی ہے، بھوک انتہا پسندی کا سبق دیتی ہے۔ اس کا حملہ بہت شدید، اس کا وار بہت بھرپور اور اس کا زخم بہت گہرا ہوتا ہے ——— بھوک دیوانے پیدا کرتی ہے، دیوانگی بھوک پیدا نہیں کرتی۔

دُنیا کے کسی کونے کا مصنف ہو، ترقی پسند ہو یا تنزل پسند، بوڑھا ہو یا جوان، اس کے پیش نظر دُنیا کے تمام بکھرے ہوئے مسائل رہتے ہیں۔ چن چن کر وہ ان پر لکھتا رہتا ہے۔ کبھی کسی کے حق میں، کبھی کسی کے خلاف۔

آج کا ادیب بنیادی طور پر آج سے پانچ سو سال پہلے کے ادیب سے کوئی زیادہ مختلف نہیں۔ ہر چیز پر نئے پرانے کا لیبل وقت لگاتا ہے، انسان نہیں لگاتا۔ ہم آج نئے ادیب کہلاتے ہیں۔ آنے والی کل ہمیں پرانا کر کے الماریوں میں بند کر دے گی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم بیکار رہے، ہم نے مفت میں مغز دردی کی۔ گھڑی کی سوئی جب ایک سے گزر کر دو کی طرف رینگتی ہے تو ایک کا ہندسہ بے مصرف نہیں ہو جاتا۔ پورا سفر طے کر کے سوئی پھر اسی ہندسے کی طرف لوٹتی ہے —— یہ گھڑی کا بھی اصول ہے اور دنیا کا بھی۔

آج کے نئے مسائل بھی گذری ہوئی کل کے پرانے مسائل سے بنیادی طور پر مختلف نہیں۔ جو آج کی برائیاں ہیں، گذری ہوئی کل ہی نے ان کے بیج بوئے تھے۔

جنسی مسائل جس طرح آج کے نئے ادیبوں کے پیشِ نظر ہیں، اسی طرح پرانے ادیبوں کے پیشِ نظر بھی تھے۔ انھوں نے ان پر اپنے رنگ میں لکھا، ہم آج اپنے رنگ میں لکھ رہے ہیں۔

مجھے معلوم نہیں، مجھ سے جنسی مسائل کے متعلق بار بار کیوں پوچھا جاتا ہے۔ شاید اس لیے کہ لوگ مجھے ترقی پسند کہتے ہیں یا شاید اس لیے کہ میرے چند افسانے جنسی مسائل کے متعلق ہیں یا پھر اس لیے کہ آج کے نئے ادیبوں کو بعض حضرات جنس زدہ قرار دے کر انھیں ادب، مذہب اور سماج سے یک قلم خارج کر دینا چاہتے ہیں —— وجہ کچھ بھی ہو، میں اپنا نقطۂ نظر بیان کیے دیتا ہوں۔

روٹی اور پیٹ، عورت اور مرد —— یہ دو بہت پرانے رشتے ہیں، ازلی اور ابدی۔ روٹی زیادہ اہم ہے یا پیٹ؟ عورت زیادہ ضروری ہے کہ مرد؟ میں اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا، اس لیے کہ میرا پیٹ روٹی مانگتا ہے لیکن مجھے یہ معلوم نہیں کہ گیہوں بھی میرے پیٹ کے لیے اتنا ہی ترستا ہے جتنا کہ میرا پیٹ۔ پھر بھی جب میں سوچتا ہوں کہ زمین نے گیہوں کے خوشوں کو بیکار جنم نہیں دیا ہوگا تو مجھے خوش فہمی ہوتی ہے کہ میرے پیٹ ہی کے لیے وسیع و عریض کھیتوں میں سنہری بالیاں جھومتی ہیں اور پھر ہو سکتا ہے کہ میرا پیٹ پہلے پیدا ہوا ہو اور گیہوں کی یہ بچیاں کچھ دیر کے بعد۔

کچھ بھی ہو، یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ دنیا کا ادب صرف ان دو رشتوں ہی سے متعلق ہے —— الہامی کتابیں بھی جن کو آسمانی ادب کہنا چاہیے، روٹی اور پیٹ، عورت اور مرد کے تذکروں سے خالی نہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ مسائل اتنے پرانے ہیں کہ ان کا ذکر الہامی کتابوں میں بھی آ چکا ہے تو پھر کیوں آج کے ادیب ان پر خامہ فرسائی کرتے ہیں۔ کیوں عورت اور مرد کے تعلقات کو بار بار کریدا جاتا ہے اور بقول شخصے عریانی پھیلائی جاتی ہے —— جواب اس سوال کا یہ ہے کہ اگر ایک ہی بار، جھوٹ نہ بولنے اور چوری نہ کرنے کی تلقین کرنے پر ساری دنیا جھوٹ اور چوری سے پرہیز کرتی تو شاید ایک ہی پیغمبر کافی ہوتا —— لیکن جیسا آپ جانتے ہیں، پیغمبروں کی فہرست خاصی لمبی ہے۔

ہم لکھنے والے پیغمبر نہیں۔ ہم ایک ہی چیز کو، ایک ہی مسئلے کو مختلف حالات میں مختلف زاویوں سے دیکھتے ہیں اور جو کچھ ہماری سمجھ میں آتا ہے، دنیا کے سامنے پیش کر دیتے ہیں اور دنیا کو کبھی مجبور نہیں کرتے کہ وہ اسے قبول ہی کرے۔

ہم قانون ساز نہیں، محتسب بھی نہیں۔ احتساب اور قانون سازی دوسروں کا کام ہے —— ہم

حکومتوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں لیکن خود حاکم نہیں بنتے۔ ہم عمارتوں کے نقشے بناتے ہیں لیکن ہم معمار نہیں۔ ہم مرض بتاتے ہیں لیکن دواخانوں کے مہتمم نہیں ہیں۔

ہم جنسیات پر نہیں لکھتے۔ جو سمجھتے ہیں کہ ہم ایسا کرتے ہیں، یہ ان کی غلطی ہے۔ ہم اپنے افسانوں میں خاص عورتوں اور خاص مردوں کے حالات پر روشنی ڈالتے ہیں ——— کسی افسانے کی ہیروئن سے اگر اس کا مرد صرف اس لیے متنفر ہو جاتا ہے کہ وہ سفید کپڑے پسند کرتی ہے اور سادگی پسند ہے تو دوسری عورتوں کو اسے اصول نہیں سمجھ لینا چاہیے ——— یہ نفرت کیوں پیدا ہوئی اور کن حالات میں پیدا ہوئی، اس استفہام کا جواب آپ کو ہمارے افسانے میں ضرور مل جائے گا۔

جو لوگ ہمارے افسانوں میں لذت حاصل کرنے کے طریقے دیکھنا چاہتے ہیں، انھیں یقیناً ناامیدی ہوگی۔ ہم داؤ پیچ بتانے والے خلیفے نہیں۔ ہم جب اکھاڑے میں کسی کو گرتا دیکھتے ہیں تو اپنی سمجھ کے مطابق آپ کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ کیوں گرا تھا؟

ہم رجائی ہیں۔ دنیا کی سیاہیوں میں بھی ہم اُجالے کی لکیریں دیکھ لیتے ہیں۔ ہم کسی کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتے ——— چکلوں میں جب کوئی کھسیائی اپنے کوٹھے پر سے کسی راہ گزر پر پان کی پیک تھوکتی ہے تو ہم دوسرے تماشائیوں کی طرح نہ تو کبھی اس راہ گزر پر ہنستے ہیں اور نہ کبھی اس کھسیائی کو گالیاں دیتے ہیں۔ ہم یہ واقعہ دیکھ کر رک جائیں گے۔ ہماری نگاہیں اس غلیظ پیشہ ور عورت کے نیم عریاں لباس کو چیرتی ہوئی اس کے سیاہ عصیاں بھرے جسم کے اندر داخل ہو کر اس کے دل تک پہنچ جائیں گی، اس کو ٹٹولیں گی اور ٹٹولتے ٹٹولتے ہم خود کچھ عرصے کے لیے تصور میں وہی کریہہ اور متعفن رنڈی بن جائیں گے، صرف اس لیے کہ ہم اس واقعے کی تصویر ہی نہیں بلکہ اس کے اصل محرک کی وجہ بھی پیش کر سکیں۔

جب کسی اچھے خاندان کی جوان، صحت مند اور خوبصورت لڑکی کسی مریل، بدصورت اور قلاش لڑکے کے ساتھ بھاگ جاتی ہے تو ہم اسے ملعون قرار نہیں دیں گے۔ دوسرے اس لڑکی کا ماضی، حال اور مستقبل اخلاق کی پھانسی میں لٹکا دیں گے لیکن ہم وہ چھوٹی سی گرہ کھولنے کی کوشش کریں گے جس نے اس لڑکی کے ادراک کو بے حس کیا۔

انسان ایک دوسرے سے کوئی زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ جو غلطی ایک مرد کرتا ہے، دوسرا بھی کر سکتا ہے۔ جب ایک عورت بازار میں دکان لگا کر اپنا جسم بیچ سکتی ہے تو دنیا کی سب عورتیں ایسا کر سکتی ہیں۔ غلط کار انسان نہیں، وہ حالات ہیں جن کی کھیتیوں میں انسان اپنی غلطیاں پیدا کرتا ہے اور ان کی فصلیں کاٹتا ہے۔

زیادہ تر جنسی مسائل ہی آج کے نئے ادیبوں کی توجہ کا مرکز کیوں بنے ہیں، اس کا جواب معلوم کرنا کوئی زیادہ مشکل نہیں۔ یہ زمانہ عجیب و غریب قسم کے اضداد کا زمانہ ہے۔ عورت قریب بھی ہے، دور بھی۔ کہیں مادر زاد برہنگی نظر آتی ہے، کہیں سر سے لے کر پیر تک ستر۔ کہیں عورت مرد کے بھیس میں دکھائی دیتی ہے، کہیں مرد عورت کے بھیس میں۔

دنیا ایک بہت بڑی کروٹ لے رہی ہے۔ ہندوستان بھی جہاں آزادی کا ننھا منا بچہ غلامی کے دامن سے اپنے آنسو پونچھ رہا ہے، مٹی کا نیا گھروندا بنانے کے لیے ضد کر رہا ہے ——— مشرقی تہذیب کی چولی کے بند کبھی کھولے جاتے ہیں، کبھی بند کیے جاتے ہیں۔ مغربی تہذیب کے چہرے کا غازہ کبھی ہٹایا جاتا ہے، کبھی لگایا جاتا ہے۔ ایک افراتفری سی مچی ہے ——— نئے کھٹ بُنے پرانی کھاٹوں کی مونج ادھیڑ رہے ہیں، پرانے کھٹ بُنے چلا رہے

ہیں۔ ملی ہوئی چولوں سے کہیں کھٹمل نکل رہے ہیں کہیں پسّو۔ کوئی کہتا ہے، انھیں زندہ رہنے دو۔ کوئی کہتا ہے، نہیں، فنا کر دو۔ اس دھاندلی میں، اس شورش میں ہم نئے لکھنے والے اپنے قلم سنبھالے کبھی اس مسئلے سے ٹکراتے ہیں کبھی اس مسئلے سے۔

اگر ہماری تحریروں میں عورت اور مرد کے تعلقات کا ذکر آپ کو زیادہ نظر آئے تو یہ ایک فطری بات ہے ——— ملک، ملک سے، سیاسی طور پر جدا کیے جاسکتے ہیں۔ ایک مذہب دوسرے مذہب سے عقیدوں کی بنا پر علیحدہ کیا جاسکتا ہے۔ دو زمینوں کو ایک قانون ایک دوسرے سے بیگانہ کر سکتا ہے لیکن کوئی سیاست، کوئی عقیدہ، کوئی قانون عورت اور مرد کو ایک دوسرے سے دور نہیں کر سکتا۔

عورت اور مرد میں جو فاصلہ ہے، اس کو عبور کرنے کی کوشش ہر زمانے میں ہوتی رہے گی۔ عورت اور مرد میں جو ایک لرزتی ہوئی دیوار حائل ہے، اسے سنبھالنے اور گرانے کی سعی ہر صدی، ہر قرن میں ہوتی رہی ہے۔ جو اسے عریانی سمجھتے ہیں، انھیں اپنے احساس کے ننگ پر افسوس ہونا چاہیے۔ جو اسے اخلاق کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں، انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اخلاق زنگ ہے جو سماج کے اُسترے پر بے احتیاطی سے جم گیا ہے۔

جو سمجھتے ہیں کہ نئے ادب نے جنسی مسائل پیدا کیے ہیں، غلطی پر ہیں کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ جنسی مسائل نے اس نئے ادب کو پیدا کیا ہے، یہ نیا ادب جس میں آپ کبھی کبھی اپنا ہی عکس دیکھتے ہیں اور جھنجلا اُٹھتے ہیں ——— حقیقت خواہ شکر ہی میں لپیٹ کر پیش کی جائے، اس کی کڑواہٹ دور نہیں ہوگی۔

ہماری تحریریں آپ کو کڑوی اور کسیلی لگتی ہیں مگر اب تک جو مٹھاسیں آپ کو پیش کی جاتی رہی ہیں، ان سے انسانیت کو کیا فائدہ ہوا ہے؟ نیم کے پتے کڑوے سہی مگر خون ضرور صاف کرتے ہیں۔

کسوٹی

یہ نئی چیزوں کا زمانہ ہے۔ نئے جوتے، نئی ٹھوکریں، نئے قانون، نئے جرائم، نئی گھڑیاں، نئی بے وقتیاں، نئے آقا، نئے غلام اور لطف یہ ہے کہ ان نئے غلاموں کی کھال بھی نئی ہے جو ادھڑ ادھڑ کر جدت پسند ہو گئی ہے۔ اب ان کے لیے نئے کوڑے اور نئے چابک تیار ہو رہے ہیں۔

ادب بھی نیا ہے جس کے بے شمار نام ہیں۔ کوئی اسے ترقی پسند کہتا ہے، کوئی تنزل پسند۔ کوئی فحش کہتا ہے، کوئی مزدور پرست۔ اس نئے ادب کو پرکھنے کے لیے نئی کسوٹیاں بھی موجود ہیں ——— یہ کسوٹیاں پرچے ہیں۔ سالنامے، ماہنامے، ہفتہ وار اور روزانہ ——— ان پرچوں کے مالک اور ایڈیٹر بھی نئے ہیں۔ کوئی پاکستانی ہے، کوئی اکھنڈ ہندوستانی۔ کوئی کانگرسی ہے، کوئی کمیونسٹ ——— سب اپنی اپنی کسوٹی پر اس نئے ادب کو پرکھتے رہتے ہیں اور اس کا کھوٹا کھرا بتاتے رہتے ہیں مگر ادب سونا نہیں جو اس کے گھٹتے بڑھتے بھاؤ بتائے جائیں۔ ادب زیور ہے اور جس طرح خوبصورت زیور خالص سونا نہیں ہوتے، اسی طرح خوبصورت ادب پارے بھی خالص حقیقت نہیں ہوتے۔ ان کو سونے کی طرح پتھروں پر گھس گھس کر پرکھنا بہت بڑی بے ذوقی ہے۔

ادب یا تو ادب ہے، ورنہ ایک بہت بڑی بے ادبی ہے۔ زیور یا تو زیور ہے، ورنہ ایک بہت ہی بدنما شے ہے۔ ادب اور غیر ادب، زیور اور غیر زیور میں کوئی درمیانی علاقہ نہیں۔

یہ زمانہ نئے دردوں اور نئی ٹیسوں کا زمانہ ہے۔ ایک نیا دور پرانے دور کا پیٹ چیر کر پیدا کیا جا رہا ہے۔ پرانا دور موت کے صدمے سے رو رہا ہے، نیا دور زندگی کی خوشی سے چلا رہا ہے۔ دونوں کے گلے رندھے پڑے ہیں، دونوں کی آنکھیں نمناک ہیں ——— اس نمی میں اپنے قلم ڈبو کر لکھنے والے لکھ رہے ہیں۔ نیا ادب ہے، زبان وہی ہے، صرف لہجہ بدل گیا ہے۔ دراصل اسی بدلے ہوئے لہجے کا نام نیا ادب، ترقی پسند ادب، فحش ادب یا مزدور پرست ادب ہے۔

جب کسی انسان کا لہجہ بدل جاتا ہے، جب کوئی انسان ہنستے ہنستے رونے لگتا ہے، جب کسی راگ کے مدھم سُر ایکا ایکی اونچے ہو جاتے ہیں، جب بچہ بلکنے لگتا ہے تو آلۂ مقیاس الصوت یعنی آواز ناپنے والے آلے سے میکانکی طریقہ پر اس تبدیلی کو نہیں جانچتے۔ جو اہلِ دانش ہیں، جو صاحبِ ذوق ہیں، ہمیشہ اس کیفیت یا جذبے، اس محرک کو ٹٹولنے کی کوشش کریں گے جس نے یہ تبدیلی پیدا کی۔

ادب ایک فرد کی اپنی زندگی کی تصویر نہیں جب کوئی ادیب قلم اٹھاتا ہے تو وہ اپنے گھریلو معاملات کا روزنامچہ نہیں لکھتا۔ اپنی ذاتی خوشیوں، رنجشوں، بیماریوں اور تندرستیوں کا ذکر نہیں کرتا۔ اس کی قلمی تصویروں میں، بہت ممکن ہے، آنسو اس کی دکھی بہن کے ہوں، مسکراہٹیں آپ کی ہوں اور قہقہے ایک خستہ حال مزدور کے۔ اس لیے اپنے آنسوؤں، اپنی مسکراہٹوں اور اپنے قہقہوں کی ترازو میں ان تصویروں کو تولنا بہت بڑی غلطی ہے۔ ہر ادب پارہ ایک خاص فضا، ایک خاص اثر، ایک خاص مقصد کے لیے پیدا ہوتا ہے۔ اگر اس میں وہ خاص فضا، وہ خاص اثر اور وہ خاص مقصد محسوس نہ کیا جائے تو وہ ایک بے جان لاش رہ جائے گی۔

ادب لاش نہیں جسے ڈاکٹر اور اس کے چند شاگرد پتھر کی میز پر لیٹا کر پوسٹ مارٹم شروع کر دیں۔ ادب بیماری نہیں، بلکہ بیماری کا ردِ عمل ہے۔ ادب دوا بھی نہیں جس کے استعمال کے لیے اوقات اور مقدار کی پابندی عاید کی جاتی ہے۔ ادب درجۂ حرارت ہے اپنے ملک کا، اپنی قوم کا ——— ادب اپنے ملک، اپنی قوم، اس کی صحت اور علالت کی خبر دیتا رہتا ہے ——— پرانی الماری کے کسی خانے سے ہاتھ بڑھا کر کوئی گرد آلود کتاب اٹھائیے، بیتے ہوئے زمانے کی نبض آپ کی انگلیوں کے نیچے دھڑکنے لگے گی۔

کتنی صدیاں گزر چکی ہیں، کتنی نسلیں ان گزری ہوئی صدیوں کے نیچے دفن ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ لاشوں کا ایک انبار ہے جس کی چوٹی پر ہم کھڑے ہیں اور نیچے ایک اتھاہ سمندر کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ آسمان کی طرف نگاہ اٹھاتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم اس کے بالکل قریب پہنچ گئے ہیں۔ لیکن آنے والے زمانے کی ایک چھوٹی سی کروٹ، ایک اور صدی ہماری لاشوں پر ہماری اولاد کو کھڑا کر دے گی۔ اور ہماری اولاد سمجھے گی ہم اونچے ہیں لیکن سب سے پہلی صدی کی لاش کہاں ہے؟ کس حالت میں ہے؟ کسی کو کچھ معلوم نہیں ——— لیکن قصۂ آدم وہی ہے۔ ایک عورت اور ایک مرد۔ دو عورتیں اور ایک مرد یا دو مرد اور ایک عورت ——— یہ گردان ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔

انسان کو بھوک پہلے بھی لگتی تھی، اب بھی لگتی ہے۔ طاقت کا خواہاں پہلے بھی تھا، اب بھی ہے۔ شعر و شراب کا شوقین جیسا پہلے تھا ویسا ہی اب ہے ——— تبدیلی کیا ہوئی ہے، کچھ بھی نہیں۔ روٹی، عورت اور تخت ——— اور اگر انسان ان سے اکتا گیا تو خدا، یعنی ایک ایسی طاقت جو روٹی، عورت اور تخت سے کہیں زیادہ ناقابلِ فہم اور ناقابلِ رسا ہے۔

انسان عورت سے محبت کرتا ہے تو ہیر رانجھا کی داستان بن جاتی ہے، روٹی سے محبت کرتا ہے تو اپنی کیوریس کا فلسفہ پیدا ہو جاتا ہے، تخت سے پیار کرتا ہے تو اسکندر، چنگیز، تیمور یا ہٹلر بن جاتا ہے اور جب خدا سے لو لگاتا ہے تو مہاتما بدھ کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔

دنیا بہت وسیع ہے۔ کوئی چیونٹی مارنا بہت بڑا پاپ سمجھتا ہے، کوئی لاکھوں انسان ہلاک کر دیتا ہے اور اپنے اس فعل کو بہادری اور شجاعت سے تعبیر کرتا ہے۔ کوئی مذہب کو لعنت سمجھتا ہے، کوئی اسی کو سب سے بڑی نعمت ——— انسان کو کس کسوٹی پر پرکھا جائے؟ یوں تو ہر مذہب کے پاس ایک بٹیا موجود ہے جس پر انسان کس کر پرکھے جاتے ہیں مگر وہ بٹیا کہاں ہے؟ سب قوموں، سب مذہبوں، سب انسانوں کی واحد کسوٹی جس پر آپ مجھے اور میں آپ کو پرکھ سکتا ہوں، وہ دھرم کانٹا کہاں ہے جس کے پلڑوں میں ہندو اور مسلمان، عیسائی اور یہودی، کالے اور گورے تل سکتے ہیں؟

یکسوٹی، یہ دھرم کانٹا جہاں کہیں بھی ہے، نیا ہے نہ پرانا۔ ترقی پسند ہے نہ تنزل پسند۔ عریاں ہے نہ مستور۔ فحش ہے نہ مطہر ——— انسان اور انسان کے سارے فعل اسی ترازو میں تولے جا سکتے ہیں۔ میرے نزدیک کسی اور ترازو کا تصور کرنا بہت ہی بڑی حماقت ہے۔

ہر انسان دوسرے انسان کے پتھر مارنا چاہتا ہے، ہر انسان دوسرے انسان کے افعال پر کھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ اس کی فطرت ہے جسے کوئی بھی حادثہ تبدیل نہیں کر سکتا۔ میں کہتا ہوں، اگر آپ میرے پتھر مارنا ہی چاہتے ہیں تو خدارا ذرا سلیقے سے ماریے۔ میں اس آدمی سے ہرگز ہرگز اپنا سر پھڑوانے کے لیے تیار نہیں جسے سر پھوڑنے کا سلیقہ ہی نہیں آتا۔ اگر آپ کو یہ سلیقہ نہیں آتا تو سیکھیے ——— دنیا میں رہ کر جہاں آپ نمازیں پڑھنا، روزے رکھنا اور محفلوں میں جانا سیکھتے ہیں، وہاں پتھر مارنے کا ڈھنگ بھی آپ کو سیکھنا چاہیے۔

آپ خدا کو خوش کرنے کے لیے سَو حیلے کرتے ہیں۔ میں آپ کے اس قدر نزدیک ہوں، مجھے خوش کرنا بھی آپ کا فرض ہے۔ میں نے آپ سے کچھ زیادہ طلب تو نہیں کیا؟ مجھے بڑے شوق سے گالیاں دیجیے۔ میں گالی کو بُرا نہیں سمجھتا، اس لیے کہ یہ کوئی غیر فطری چیز نہیں لیکن ذرا سلیقے سے دیجیے۔ نہ آپ کا منہ بدمزہ ہو اور نہ میرے ذوق کو صدمہ پہنچے۔

میرے نزدیک بس یہ سلیقہ ہی ایک کسوٹی ہے۔ انسان کے ہر فعل کے لیے، اس کے گناہ کے لیے، اس کے ثواب کے لیے، اس کی شاعری کے لیے، اس کے افسانوں کے لیے ——— مجھے نام نہاد نقادوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ نکتہ چینیاں صرف پتیاں نوچ کر بکھیر سکتی ہیں، انھیں جمع کر کے ایک سالم پھول نہیں بنا سکتیں۔

بہت سے نقاد گزر چکے ہیں لیکن ادب سے بے ادبیاں دُور نہیں ہوئیں۔ بہت سے پیغمبر آ چکے ہیں لیکن انسان ایک دوسرے سے متحد نہیں ہوئے ——— یہ ایک بہت بڑا الم ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ یہ الم ہی انسانیت کی قسمت ہے۔ اس کی زندگی اور اس کی موت، اس کی جوانی اور اس کا بڑھاپا ——— یہ الم ہی سعادت حسن منٹو ہے۔ یہ الم ہی آپ ہیں۔ یہ الم ہی ساری دُنیا ہے جس میں کسوٹیاں زیادہ ہیں اور کسے جانے والے کم، جس میں پتھر کم ہیں اور سر پھوڑنے والے زیادہ۔ ۔ ۔

عصمت فروشی

عِصمت فروشی کوئی خلافِ عقل یا خلافِ قانون چیز نہیں۔ یہ ایک پیشہ ہے جس کو اختیار کرنے والی عورتیں چند سماجی ضروریات پوری کرتی ہیں جس شے کے گاہک موجود ہوں، اگر وہ مارکیٹ میں نظر آئے تو ہمیں تعجب نہ کرنا چاہیے۔ اگر ہمیں ہر شہر میں ایسی عورتیں نظر آتی ہیں جو اس جسمانی تجارت سے اپنا پیٹ پالتی ہیں تو ہمیں اُن کے ذریعۂ معاش پر کوئی اعتراض نہ ہونا چاہیے، اس لیے کہ ہر شہر میں اُن کے گاہک موجود ہیں۔

عصمت فروشی کو گناہ کبیرہ یقین کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے یہ بہت بڑا گناہ ہو مگر ہم مذہبی نقطۂ نظر سے اس کو جانچنا نہیں چاہتے۔ گناہ اور ثواب، سزا اور جزا کی بھول بھلیوں میں پھنس کر آدمی کسی مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور نہیں کر سکتا۔ مذہب خود ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، اگر اس میں لپیٹ کر کسی اور مسئلے کو دیکھا جائے تو ہمیں بہت ہی مغز ماری کرنا پڑے گی۔ اس لیے مذہب کو عصمت فروشی سے الگ کر کے ہم نے ایک طرف رکھ دیا ہے۔

عِصمت فروشی کیا ہے...؟

عصمت کو بیچنا یعنی اُس گوہر کا بیچنا جس کو عورت کی زندگی کا سب سے قیمتی زیور یقین کیا جاتا ہے۔ اس زیور کی قدر اس لیے بہت زیادہ بڑھ گئی ہے کہ تجربے نے ہمیں بتایا ہے، عورت جب ایک بار اس کو کھو دیتی ہے تو سماج کی نگاہوں میں اس کی کوئی عزت نہیں رہتی۔ یہ گوہر کئی طریقوں سے ضائع ہوتا ہے: جب عورت کی شادی ہو جائے تو یہ گوہر خاوند کی جیب میں چلا جاتا ہے۔ بعض اوقات مرد اسے زبردستی حاصل کر لیتے ہیں اور بعض اوقات شادی کے بغیر عورتیں اسے اپنے دل پسند مردوں کے حوالے کر دیتی ہیں۔ بعض عورتیں حالات سے مجبور ہو کر اسے بیچ دیتی ہیں اور بعض اس کی تجارت کرتی ہیں۔

ہم اُن عورتوں کے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہیں جو پیشے کے طور پر اپنی عصمت بیچتی ہیں، حالانکہ یہ بالکل واضح چیز ہے کہ عصمت صرف ایک بار کھوئی یا بیچی جا سکتی ہے۔ بار بار اس کو بیچا یا کھویا نہیں جا سکتا، لیکن چونکہ اس پیشے کو عرفِ عام میں عصمت فروشی کہا جاتا ہے، اس لیے ہم اسے عِصمت فروشی ہی کہیں گے۔

عِصمت فروش عورت ایک زمانے سے دنیا کی سب سے ذلیل ہستی سمجھی جاتی رہی ہے مگر کیا ہم نے غور کیا ہے کہ ہم میں سے اکثر ایسی ذلیل و خوار ہستیوں کے در پر ٹھوکریں کھاتے ہیں —— کیا ہمارے دل میں یہ خیال پیدا نہیں ہوتا کہ ہم بھی ذلیل...

مقامِ تاسف ہے کہ مردوں نے اس پر کبھی غور نہیں کیا۔ مرد اپنے دامن پر ذلت کے ہر دھبے کو عصمت فروش عورت

ے دل کی سیاہی سے تعبیر کرے گا۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ عورتوں میں، خواہ وہ کسبی ہوں یا غیر کسبی، ننانوے فی صد ایسی ہوں گی جن کے دل عصمت فروشی کی تاریک تجارت کے باوجود بدکار مردوں کے دل کی بہ نسبت کہیں زیادہ روشن ہوں گے۔ موجودہ نظام کے تحت، جس کی باگ ڈور صرف مردوں کے ہاتھ میں ہے، عورت خواہ وہ عصمت فروش ہو یا باعصمت، ہمیشہ دبی رہی ہے۔ مرد کو اختیار ہوگا کہ وہ اُس کے متعلق جو چاہے رائے قائم کرے۔

ہم نے متعدد بار اپنے کانوں سے تعیش پسند اسیروں کو اپنا مال اسباب شہوت کے تنور میں ایندھن کے طور پر جلا کر یہ کہتے سُنا ہے کہ فلاں طوائف یا فلاں ویشیا نے اُن کو تباہ و برباد کر دیا ہے ——— یہ معمّا ابھی تک ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔

ویشیا یا طوائف اپنے تجارتی اصولوں کے ماتحت ہر مرد سے جو اُس کے پاس گاہک کے طور پر آتا ہے، زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کی کوشش کرے گی۔ اگر وہ مناسب داموں پر یا حیرت انگیز قیمت پر اپنا مال بیچتی ہے تو یہ اُس کا پیشہ ہے۔ بنیا بھی تو سودا تولتے وقت ڈنڈی مار جاتا ہے۔ بعض دکانیں زیادہ قیمت پر اپنا مال بیچتی ہیں، بعض کم قیمت پر۔

تعجب تو اس بات کا ہے کہ جب صدیوں سے ہم یہ سُن رہے ہیں، "ویشیا کا ڈسا ہوا پانی نہیں مانگتا" تو ہم کیوں اپنے آپ کو اس سے ڈسواتے ہیں اور پھر کیوں خود ہی رونا پیٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ ویشیا ارادۃً یا کسی انتقامی جذبے کے زیرِ اثر مردوں کے مال و زر پر ہاتھ نہیں ڈالتی۔ وہ سودا کرتی ہے اور کماتی ہے۔ مرد اپنی جسمانی خواہشات کی تکمیل کا معاوضہ ادا کرتے ہیں۔ بس۔۔۔

ممکن ہے، ویشیا کسی مرد سے محبت کرتی ہو لیکن ہر وہ گاہک جو ایک خاص جذبے کے زیرِ اثر اس کی دکان میں جاتا ہے، دل میں یہ خواہش بھی پیدا کر لے گا کہ وہ اس سے سچی محبت کرتا ہے، یہ کیوں کر ممکن ہے۔۔۔؟ ہم اگر کسی دکان سے ایک روپے کا آٹا لینے جائیں تو ہماری یہ توقع قطعی طور پر مضحکہ خیز ہو گی کہ وہ ہمیں اپنے گھر میں مدعو کرے گا اور گھر گرہستی کا کوئی لاجواب نسخہ بتائے گا۔

ویشیا اپنے اس گاہک کے روبرو جو اُس سے محبت کا طالب ہے، اپنے چہرے پر مصنوعی محبت کے جذبات پیدا کرے گی۔ یہ چیز گاہک کو خوش کر دے گی۔ مگر ویشیا اپنے سینے کی گہرائیوں میں سے ہر مرد کے لیے جو شراب پی کر اُس کے کوٹھے پر جھومنے لگتا ہے اور رومان کی ایک نئی دُنیا بسانا چاہتا ہے، محبت کی پاک اور صاف آواز نہیں نکال سکتی۔

ویشیا کو صرف باہر سے دیکھا جاتا ہے ——— اُس کے رنگ رُوپ، اُس کی بھڑکیلی پوشاک، اُس کے مکان کی آرائش و زیبائش دیکھ کر یہی نتیجہ مرتب کیا جاتا ہے کہ وہ خوش حال ہے۔ یہ درست نہیں۔

جس عورت کے دروازے شہوت کے ہر اُس شخص کے لیے کھلے ہوں جو اپنی جیبوں میں چاندی کے چند سکے رکھتا ہے خواہ وہ موچی ہو یا بھنگی، لنگڑا ہو یا لولا، خوبصورت ہو یا کریہہ المنظر، اُس کی زندگی کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ ایک بدصورت مرد جس کے منہ سے پائیوریا لگے دانتوں کے تعفن کے بھبکے نکلتے ہیں، ایک نفاست پسند ویشیا کے ہاں آتا ہے۔ چونکہ اس کی گرہ میں اُس ویشیا کے جسم کو ایک خاص وقت تک خریدنے کے لیے دام موجود ہیں، وہ نفرت کے باوجود اس گاہک کو نہیں موڑ سکتی۔ سینے پر پتھر رکھ کر اُس کو اپنے اس گاہک کی بدصورتی اور اس کے منہ کا تعفن برداشت کرنا ہی پڑتا ہے ——— وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ اُس کا ہر گاہک الو نہیں ہو سکتا۔

ٹاپسٹ عورتوں کو حیرت سے نہیں دیکھا جاتا۔ وہ عورتیں جو دایہ گیری کا کام کرتی ہیں، انھیں حیرت اور نفرت سے نہیں دیکھا جاتا۔ وہ عورتیں جو گندگی سر پر اٹھاتی ہیں، ان کی طرف حقارت سے نہیں دیکھا جاتا۔ لیکن تعجب ہے کہ ان عورتوں کو جو اچھے یا بھونڈے طریقے سے اپنا جسم بیچتی ہیں، حیرت، نفرت اور حقارت سے دیکھا جاتا ہے۔

حضرات! یہ جسم فروشی ضروری ہے . . . آپ شہر میں خوبصورت اور نفیس گاڑیاں دیکھتے ہیں۔ یہ خوبصورت اور نفیس گاڑیاں کوڑا کرکٹ اٹھانے کے کام نہیں آسکتیں۔ گندگی اور غلاظت اٹھا کر باہر پھینکنے کے لیے اور گاڑیاں موجود ہیں جنھیں آپ کم دیکھتے ہیں اور اگر دیکھتے ہیں تو فوراً اپنی ناک پر رومال رکھ لیتے ہیں ——— ان گاڑیوں کا وجود ضروری ہے اور ان عورتوں کا وجود بھی ضروری ہے جو آپ کی غلاظت اٹھاتی ہیں۔ اگر یہ عورتیں نہ ہوتیں تو ہمارے سب گلی کوچے مردوں کی غلیظ حرکات سے بھرے ہوتے۔

یہ عورتیں اجڑے ہوئے باغ ہیں، گھورے ہیں جن میں گندے پانی کی موریاں بہہ رہی ہیں۔ یہ ان گندی موریوں ہی پر زندہ رہتی ہیں ——— ہر انسان کیسے ایک ہی جیسے شاندار طریقے پر زندگی بسر کر سکتا ہے؟

ذرا خیال فرمائیے، شہر کے ایک کونے میں ایک ویشیا کا مکان ہے۔ رات کی سیاہی میں ایک مرد جو اپنے سینے میں رات کی سیاہی سے بھی زیادہ سیاہ دل رکھتا ہے، اپنے جسم کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لیے بے دھڑک اس کے مکان میں چلا جاتا ہے۔ ویشیا اس مرد کے دل کی سیاہی سے واقف ہے۔ اُس سے نفرت بھی کرتی ہے۔ وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ اس کا اپنا وجود دامنِ انسانیت پر ایک بدنما دھبہ ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ وہ از منۂ بربریت کا ایک خوفناک نمونہ ہے مگر وہ اپنے گھر کے دروازے اُس مرد پر بند نہیں کر سکتی ——— جو دروازے معاشی کشمکش نے ایک دفعہ کھول دیے ہوں، بہت مشکل سے بند کیے جا سکتے ہیں۔

ویشیا جو عورت پہلے ہے ویشیا بعد میں، چند سکوں کے عوض اپنا جسم مرد کے حوالے کر دیتی ہے لیکن اُس کی روح اس وقت جسم میں نہیں ہوتی ——— ایک ویشیا کے الفاظ سنیے: لوگ مُجھے باہر کھیتوں میں لے جاتے ہیں . . . میں لیٹی رہتی ہوں بالکل بے حس و بے حرکت، لیکن میری آنکھیں کھلی رہتی ہیں۔ میں دور بہت دور ان درختوں کو دیکھتی رہتی ہوں جن کی چھاؤں میں کئی بکریاں آپس میں لڑ جھگڑ رہی ہوتی ہیں۔ کتنا پیارا منظر ہوتا ہے . . . میں بکریاں گننا شروع کر دیتی ہوں یا پیڑوں کی ٹہنیوں پر کوؤں کو شمار کرنے لگتی ہوں . . . اُنیس۔ بیس۔ اکیس۔ بائیس . . . اور مجھے معلوم بھی نہیں ہوتا کہ میرا ساتھی اپنے کام سے فارغ ہو کر ایک طرف ہانپ رہا ہے . .

مشاہدہ بتلاتا ہے کہ ویشیائیں عام طور پر خدا ترس ہوتی ہیں ——— ہر ہندو ویشیا کے مکان پر کسی نہ کسی کمرے میں آپ کو کرشن بھگوان یا گنیش مہاراج کی مورتی یا تصویر ضرور نظر آئے گی۔ وہ اس مورتی کی صدق دل سے پوجا کرتی ہے جتنی کہ ایک باعصمت گھریلو عورت کر سکتی ہے۔ اسی طرح وہ ویشیا جو مسلمان ہے، ماہ رمضان میں روزے ضرور رکھے گی۔ محرم میں اپنا کاروبار بند رکھے گی، سیاہ کپڑے پہنے گی، غریبوں کی مدد کرے گی اور خاص خاص موقعوں پر خدا کے حضور میں عجز و نیاز کا نذرانہ بھی ضرور پیش کرے گی۔ بادی النظر میں عصمت باختہ عورتوں کا مذہب سے یہ لگاؤ ایک ڈھونگ معلوم ہوتا ہے مگر حقیقت میں یہ اُن کی روح کا وہ

حصّہ پیش کرتا ہے جو سماج کے زنگ سے یہ عورتیں بچا بچا کے رکھتی ہیں ——— دوسرے مذہب کی ویشیائیں بھی آپ کو روحانی طور پر اپنے اپنے مذہب کے ساتھ بڑی مضبوطی سے جڑی نظر آئیں گی۔ کرسچین ویشیا گرجے میں نماز کے لیے ضرور جائے گی۔ وہ کنواری مریم کی تصویر کے پاس دیا ضرور جلائے گی۔ دراصل اس تجارت میں ویشیا اپنے جسم کو لگاتی ہے نہ کہ روح کو ——— بھنگ یا چرس بیچنے والا ضروری نہیں کہ ان منشیات کا عادی ہو! ٹھیک اسی طرح ہر مولوی یا پنڈت پاکباز نہیں ہو سکتا۔

جسم داغا جا سکتا ہے مگر روح نہیں داغی جا سکتی ——— ویشیا اپنی تاریک تجارت کے باوجود روشن روح کی مالک ہو سکتی ہے۔ وہ اپنے جسم کی قیمت بڑی بے دردی سے وصول کرتی ہو تو ہو، مگر وہ غریبوں کی وسیع پیمانے پر مدد بھی کر سکتی ہے۔ ممکن ہے، بڑے بڑے امیر اُس کے دل میں اپنی محبت پیدا نہ کر سکے ہوں مگر وہ سڑکوں پر سونے والے ایک آوارہ گرد کی پھٹی ہوئی جیب میں اپنا دل ڈال سکتی ہے۔

ویشیا دولت کی بھوکی ہوتی ہے لیکن کیا دولت کی بھوکی محبت کی بھوکی نہیں ہو سکتی . . . ؟ یہ ایسا سوال ہے جس کے جواب میں ہمیں تفصیل سے کام لینا پڑے گا: خاندانی ویشیا اور نو کسبیہ ویشیا میں بہت فرق ہے اور پھر وہ عورتیں یا لڑکیاں جو اپنے غریب ماں باپ یا اپنے یتیم بچوں کی پرورش کے لیے مجبوراً اپنا جسم چھپ چھپ کر فروخت کرتی ہیں، ان کی حیثیت متذکرہ صدر اقسام سے بالکل جداگانہ ہے ——— خاندانی ویشیا سے ہماری مراد وہ کسبی ہے جو ویشیا کے بطن سے پیدا ہوتی ہے اور اُسی کے گھر میں پالی پوسی جاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ عورت جس کو خاص اصولوں کے ماتحت ویشیا بننے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ایسی عورتیں جو اس ماحول میں پرورش پاتی ہیں، عشق و محبت کو عام طور پر ایسا سکّہ تصور کرتی ہیں جو ان کے بازار میں نہیں چل سکتا۔ یہ نظریہ درست ہے، اس لیے کہ اگر وہ ہر اُس مرد کو جو اُن کے پاس چند لمحات گزارنے کے لیے آئے، اپنا دل دے دیں تو ظاہر ہے کہ وہ اپنے کاروبار میں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ عام طور پر یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ اس اسکول کی ویشیاؤں کے سینے میں عشق و محبت کا عنصر کم ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ دوسری عورتوں کے مقابلے میں مردوں سے عشق کرنے میں بڑی احتیاط اور بڑے بخل سے کام لیتی ہیں۔ مردوں سے روزانہ میل جول ان کے دل میں ایک ناقابلِ بیان تلخی پیدا کر دیتا ہے۔ وہ مردوں کو حیوانوں سے بدتر سمجھنے لگتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس ضمن میں ایک حد تک "منکر" ہو جاتی ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اُن کا سینہ محبت کے لطیف جذبات سے خالی ہوتا ہے ——— جس طرح بھنگن کی لڑکی کو گندگی کا پہلا ٹوکرا اُٹھاتے وقت گھن نہیں آئے گی، اُسی طرح اپنے پیشے کا پہلا قدم اُٹھاتے وقت ایسی ویشیاؤں کو بھی حجاب محسوس نہیں ہو گا۔ آہستہ آہستہ حیا اور جھجک سے متعلقہ قریب قریب تمام جذبات اُن میں گھس گھسا کر مٹ جاتے ہیں۔ چکلے کے اندر جہاں شہوت پرست مردوں کے لیے ان عورتوں کے مکان کھلے رہتے ہیں، لطیف جذبات کیسے داخل ہو سکتے ہیں ——— جس طرح باعصمت عورتیں ویشیاؤں کی طرف حیرت اور تعجب سے دیکھتی ہیں، ٹھیک اسی طرح وہ بھی اُن کی طرف اسی نظر سے دیکھتی ہیں۔ اول الذکر کے پیشِ نظر یہ استفہام ہوتا ہے: کیا عورت اس قدر ذلیل ہو سکتی ہے؟ مؤخر الذکر یہ سوچتی ہیں: یہ پاکباز عورتیں کیسی ہیں . . . کیا ہیں؟

ویشیا جس کی ماں ویشیا تھی، جس کی دادی ویشیا تھی، جس کی پردادی ویشیا تھی، جس نے ویشیا کا دودھ پیا، جو عصمت فروشی کے گہوارے میں پلی، وہیں بڑی ہوئی، جس کی تجارت کا آغاز بھی وہیں شروع ہوا،

عصمت اور باعصمت عورتوں کے متعلق کیا سمجھ سکتی ہے؟

اُن سو لڑکیوں میں سے جو ویشیاؤں کے گھر میں پیدا ہوتی ہیں، شاید ایک دو کے دل میں اپنے گردوپیش کے ماحول سے نفرت پیدا ہوتی ہے اور وہ اپنے جسم کو صرف ایک مرد کے حوالے کرنے کا تہیہ کرتی ہیں لیکن باقی سب اسی راستے پر چلتی ہیں جو ان کی ماؤں نے ان کے لیے منتخب کیا ہوتا ہے۔

جس طرح ایک دکان دار کا بیٹا اپنی نئی دکان کھولنے کا شوق رکھتا ہے اور اس شوق کا اظہار مختلف طریقوں سے کرتا ہے، ٹھیک اسی طرح ویشیاؤں کی جوان لڑکیاں اپنا پیشہ شروع کرنے کا بڑا چاؤ رکھتی ہیں۔ چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ ایسی لڑکیاں نِت نئے طریقوں سے اپنے جسم اور حُسن کی نمائش کرتی ہیں۔ جب وہ اپنی تجارت کا آغاز کرتی ہیں تو باقاعدہ رسوم ادا کی جاتی ہیں۔ ایک خاص اہتمام کے ماتحت یہ سب کچھ کیا جاتا ہے بالکل اسی طرح، جس طرح دوسرے تجارتی کاموں کی بنیاد رکھتے وقت خاص رسوم کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔

ان حالات کے تحت، جیسا کہ ظاہر ہے، متذکرہ صدر قسم کی ویشیاؤں کے دل میں عشق پیدا ہونا مشکل ہے۔ یہاں عشق سے ہماری مراد وہی عشق ہے جو ہمارے یہاں عرصۂ دراز سے رائج ہے۔ ہیر رانجھا اور سسّی پنّوں والا عشق...! ایسی ویشیائیں عشق کرتی ہیں مگر ان کا عشق بالکل جدا قسم کا ہوتا ہے۔ وہ لیلیٰ مجنوں اور ہیر رانجھے والا عشق نہیں کر سکتیں، اس لیے کہ یہ ان کی تجارت پر بہت بُرا اثر ڈالتا ہے۔ اگر کوئی ویشیا اپنے اوقاتِ تجارت میں سے چند لمحات ایسے مرد کے لیے وقف کر دے جس سے اُسے روپے پیسے کا لالچ نہ ہو تو ہم اسے عشق و محبت کہیں گے۔ اصولاً ویشیا کو صرف مرد کی دولت سے محبت ہوتی ہے۔ اگر وہ کسی مرد سے اُس کی دولت کی خاطر نہیں بلکہ صرف اس کی خاطر ملے تو یہ اصول ٹوٹ جائے گا اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی ظاہر ہو جائے گا کہ اُس ویشیا کی جیب نہیں بلکہ اُس کا دل کارفرما ہے۔ جب دل کارفرما ہو تو عشق و محبت کے جذبے کا پیدا ہونا لازمی ہے —— چونکہ عام طور پر عورت سے عشق و محبت کرنے کا واحد مقصد جسمانی لذت ہوتا ہے، اس لیے ہم یہاں جسمانی لذتوں ہی کو عشق کے اس جذبے کا محرک سمجھیں گے، گو اس کے علاوہ اور بہت سی چیزیں بھی اس کی تخلیق و تولید کی مہیج ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر ویشیا جو اپنے کوٹھے پر ہر مرد پر حکم چلانے کی عادی ہوتی ہے، غیر مختتم ناز برداریوں سے سخت تنگ آ جاتی ہے۔ اُس کو آقا بننا پسند ہے مگر کبھی کبھی وہ غلام بننا بھی چاہتی ہے۔ ہر فرمائش پوری ہو جانے میں اُس کو بہت فائدہ ہے مگر انکار میں اور ہی لذت ہے۔ وہ ہر طرف سے دولت سمیٹتی ہے۔ یہ کام اس کا معمول بن جاتا ہے۔ اس لیے کبھی کبھی اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ وہ بھی کسی کے لیے کچھ خرچ کرے۔ اگر سب اُس کی خوشامد کرتے ہیں تو وہ بھی کسی کی خوشامد کرے۔ اگر وہ ضد کرتی ہے تو کوئی اس سے بھی ضد کرے۔ وہ سب کو دھتکارتی ہے تو کوئی اسے بھی دھتکارے، ستائے، مارے، پیٹے۔ یہ تمام چیزیں مل کر اس کے دل میں ایک خاص مرد کو اپنا رفیق بنانے پر مجبور کرتی ہیں۔ چنانچہ وہ انتخاب کرتی ہے۔

انتخاب کا یہ وقت بہت نازک ہوتا ہے۔ بہت ممکن ہے، وہ کسی رئیس زادے پر اپنے دل کے خاص دروازے کھول دے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنے کوٹھے پر چلمیں بھرنے والے چرس نوش میراثی کے غلیظ قدموں میں اپنا وہ سر رکھ دے جس کے بالوں کو چومنے کے لیے بڑے بڑے راجاؤں اور مہاراجوں نے کئی کئی ہزار طلائی اشرفیاں پانی کی طرح بہا دی ہوں، اور پھر اس پر بھی کوئی تعجب نہ ہونا چاہیے کہ وہ غلیظ آدمی اسی سر کو ٹھوکر مار کر پرے ہٹا دے —— اس قسم کے واقعات دیکھنے اور سننے میں آ چکے ہیں۔

ہمارے یہاں ایک مشہور طوائف اس وقت بھی موجود ہے جس کے عشق میں ایک نواب مدتوں لٹو بنا رہا مگر

وہ ایک نہایت ہی معمولی آدمی کے عشق میں گرفتار رہی۔ طوائف نواب کے عشق کا مضحکہ اڑاتی تھی اور اُدھر اُس کے اپنے عشق کا مضحکہ اڑایا جاتا تھا۔ نواب طوائف کے عشق میں رسوا ہوا اور طوائف اس معمولی آدمی کے عشق میں بدنام ہوئی۔

عام عورتوں کے مقابلے میں ان ویشیاؤں کے عشق کی شدت بہت زیادہ ہوتی ہے، اس لیے کہ یہ مردوں کے ساتھ ملنے جلنے سے نت نئے عاشقانہ جذبات سے متعارف ہوتی رہتی ہیں۔ جب یہ خود اس میں گرفتار ہوتی ہیں تو ان کو جلن زیادہ محسوس ہوتی ہے ——— ایسے بازاروں میں جہاں یہ عورتیں رہتی ہیں، متذکرہ صدر قسم کی کئی کہانیاں آپ کے سننے میں آسکتی ہیں؛ خاص کر اُن تعیش پسند امیروں کو جن کی ہتھیلیوں کے منہ ان جسم فروش عورتوں کے کوٹھوں پر کھلتے ہیں، ایسی کہانیاں ازبر یاد ہیں۔ یہ کہانیاں وہ اکثر مزے لے لے کر دوسروں کو سنانے کے عادی ہیں۔ اسی طرح سارنگیے، میراثی، طبلچی اور وہ لوگ جن کی آمد و رفت ایسے کوٹھوں پر عام رہتی ہے، ابھی آپ کو بہت دلچسپ قصّے سنائیں گے۔

انہی لوگوں سے سُنے سنائے قصّوں میں ہم ایک ایسی ویشیا کی کہانی مثال کے طور پر پیش کرسکتے ہیں جو ہزاروں اور لاکھوں میں کھیلتی تھی مگر اس کا دل ایک چیتھڑے لٹکائے مزدور کے کھردرے پیروں تلے ہر روز روندا جاتا تھا۔ وہ ہر شب اپنے دولت منار پرستاروں سے سیم و زر کے انبار جمع کرتی تھی مگر ایک مزدور کے میلے کچیلے سینے میں دھڑکتے ہوئے دل تک اس کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ کہتے ہیں کہ یہ نازک بدن اس مزدور کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کئی بار سڑک کے پتھروں پر سوئی۔

اس قسم کا تضاد و تخالف جو عشق و محبت کا اصلی رنگ ہے، قحبہ خانوں میں دیکھا جائے تو بہت شوخ اور پُراسرار حد تک رومانی نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ صرف عقبی منظر ہے جو پیش منظر کے ہر نقش کو اُبھارتا ہے۔ چونکہ عام طور پر ویشیا کے بارے میں یہی خیال کیا جاتا ہے کہ وہ سونا کھودنے والی کدال ہے اور محبت کے جذبات سے قطعی طور پر عاری ہے، اس لیے جب کبھی کسی ویشیا کے عشق کی ایسی داستان سننے میں آتی ہے تو بڑی عجیب و غریب اور پُراسرار معلوم ہوتی ہے۔ ہم ایسی داستانوں کو اسی وجہ سے عام عورتوں اور مردوں کے معاشقوں کی بہ نسبت زیادہ دلچسپی سے سنتے ہیں جیسے کسی مافوق العادت حادثے کی تفصیل سُن رہے ہوں حالانکہ دل اور اس کی دھڑکنوں سے عصمت فروشی یا عصمت مآبی کا کوئی تعلق نہیں ——— ایک باعصمت عورت کے سینے میں محبت سے عاری دل ہوسکتا ہے اور اس کے برعکس چکلے کی ایک ادنیٰ ترین ویشیا محبت سے بھرپور دل کی مالک ہوسکتی ہے۔

ہر عورت ویشیا نہیں ہوتی لیکن ہر ویشیا عورت ہوتی ہے۔ اس بات کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے۔

ویشیاؤں کے عشق میں ایک خاص بات قابلِ ذکر ہے ——— ان کا عشق ان کے روزمرہ کے معمول پر بہت کم اثر ڈالتا ہے۔ ایسی طوائفیں بہت کم ہوں گی جنھوں نے اس جذبے کی خاطر اپنا کاروبار قطعی طور پر بند کردیا ہو (کسی شریف لڑکی کے عشق میں گرفتار ہوکر شہر کا شریف دکان دار بھی اپنی دکان بند نہیں کرے گا) ——— عام طور پر یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ وہ اپنے عشق کے ساتھ ساتھ اپنا کاروبار بھی جاری رکھتی ہیں۔ دراصل مال و دولت حاصل کرنے کی ایک تاجرانہ طلب ان میں پیدا ہوجاتی ہے۔ نت نئے گاہک بنانا اور ہر روز اپنا مال بیچنا ایک عادت سی بن جاتی ہے اور یہی عادت بعد میں طبیعت کی شکل اختیار کرلیتی ہے، اس طور پر کہ پھر اس عادت یا طبیعت کا زندگی کے دوسرے شعبوں سے کوئی سروکار نہیں رہتا۔ جس طرح گھر کے نوکر جھٹ پٹ

اپنے آقاؤں کے بستر لگا کر انہیں آرام کا خیال کرتے ہیں، ٹھیک اسی طرح یہ عورتیں بھی اپنے گاہکوں کو نمٹا کر اپنی خوشی اور راحت کی طرف پلٹ آتی ہیں۔

دل ایسی شے نہیں جو بانٹی جاسکے۔ مرد کے مقابلے میں عورت کم ہرجائی ہوتی ہے۔ چونکہ ویشیا عورت ہے، اس لیے وہ اپنا دل تمام گاہکوں میں تقسیم نہیں کرسکتی۔ عورت کے متعلق مشہور ہے کہ وہ اپنی زندگی میں صرف ایک مرد سے محبت کرتی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ بہت حد تک ٹھیک ہے۔ ویشیا صرف اسی مرد پر اپنے دل کے تمام دروازے کھولتی ہے جس سے اسے محبت ہو۔ ہر آنے جانے والے مرد کے لیے وہ ایسا نہیں کرسکتی۔

ویشیاؤں کے بارے میں عام طور پر یہ شکایت سننے میں آتی ہے کہ وہ بڑی بے رحم اور جلاد صفت ہوتی ہیں۔ ممکن ہے، سو میں سے پانچ چھ اس نوعیت کی ہوں مگر سب کی سب ایسی نہیں ہوتیں بلکہ یوں کہیے کہ ہو نہیں سکتیں۔ ویشیا اور باعصمت عورت کا مقابلہ ہرگز ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔ ان دونوں کا مقابلہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ویشیا خود کماتی ہے اور باعصمت عورت کے پاس کما کر لانے والے کئی موجود ہوتے ہیں۔

ہمارے کانوں میں ایک ویشیا کے یہ لفظ ابھی تک گونج رہے ہیں جو اس کے دل کی تمام گہرائیاں پیش کرتے ہیں۔ آپ بھی سنیے: ویشیا ایک بے کس اور بے یار و مددگار عورت ہے۔ اس کے پاس ہر روز سینکڑوں مرد آتے ہیں ایک ہی خواہش لے کر... وہ اپنے چاہنے والوں کے ہجوم میں بھی اکیلی رہتی ہے، بالکل تن تنہا... وہ رات کے اندھیرے میں چلنے والی ریل گاڑی ہے جو مسافروں کو اپنے اپنے ٹھکانے پر پہنچا کر ایک آہنی چھت کے نیچے خالی کھڑی رہتی ہے۔ بالکل خالی، دھوئیں اور گرد و غبار سے اٹی ہوئی... لوگ ہمیں برا کہتے ہیں، معلوم نہیں کیوں... وہی مرد جو رات کی تاریکی میں ہم سے راحت مول لے کر جاتے ہیں، دن کے اجالے میں ہمیں نفرت و حقارت سے دیکھتے ہیں... ہم کھلے بندوں اپنا جسم بیچتی ہیں اور اس کو راز بنا کر نہیں رکھتیں... مرد ہمارے پاس یہ جنس خریدنے کے لیے آتے ہیں اور اس سودے کو راز بنا کر رکھتے ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کیوں...؟

ذرا اس ویشیا کا تصور کیجیے جس کا اس دنیا میں کوئی بھی نہ ہو۔ نہ بھائی نہ بہن؛ نہ ماں، نہ باپ اور نہ کوئی دوست۔ اپنے گاہکوں سے فراغت پاکر جب وہ کمرے میں اکیلی بالکل اکیلی رہ جاتی ہوگی تو اس کے دل و دماغ کی کیا کیفیت ہوتی ہوگی... یہ تاریکی اس اندھیرے میں اور کتنی تاریک ہو جاتی ہوگی... اگر سارا دن ٹوکری ڈھونے کے بعد مزدور کو اپنی تھکان دور کرنے کا ذریعہ نظر نہ آئے، اپنی دل بستگی کے لیے بیوی کی باتیں اسے نصیب نہ ہوں، نہ اس کی ماں ہو جو اس کے تھکے ہوئے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کی تمام کلفتیں دور کردے، تو بتائیے اس مزدور کی کیا حالت ہوگی——

اس مزدور اور اس ویشیا، دونوں کی حالت ایک جیسی ہے۔

ویشیا ایک رنگین شے نظر آتی ہے——کیوں؟

اس سوال کے جواب کے لیے ہمیں اپنا دل ٹٹولنا پڑے گا۔ یہ کمزوری ہم مردوں کی نگاہوں کی ہے اور اس کمزوری کے اسباب تلاش کرنے کے لیے ہمیں اپنے آپ ہی سے بات چیت کرنا پڑے گی۔ اس بارے میں غور و فکر کے بعد ہم جو

معلوم کرسکتے ہیں، یہ ہے: ویشیا کا نام لیتے وقت ہمارے دماغ میں ایک ایسی عورت کا تصور پیدا ہوتا ہے جو مرد کی شہوانی خواہشات اس کی مرضی اور ضرورت کے مطابق پوری کر سکتی ہے۔ گو عورت اور ویشیا پن، دو بالکل جدا چیزیں ہیں مگر جب ہم کسی ویشیا کے بارے میں کچھ سوچتے ہیں تو اس وقت عورت مع اپنے پیشے کے سامنے آجاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان پر اس کے ماحول اور اس کے پیشے کا بہت اثر پڑتا ہے مگر کوئی وقت ایسا بھی ہوتا ہے جب وہ ان تمام چیزوں سے الگ ہٹ کر صرف انسان ہوتا ہے۔ اسی طرح کوئی ایسا وقت بھی ضرور آتا ہو گا جب ویشیا اپنے پیشے کا لباس اتار کر صرف عورت رہ جاتی ہو گی مگر افسوس ہے کہ ہم ہر وقت عورت اور ویشیا کو ایک ہی جگہ دیکھنے کے عادی ہیں —— جب ویشیا کو ہم اس عینک سے دیکھیں تو ہمیں اس کے ساتھ وہ چیز بھی نظر آتی ہے جسے ہم مرد عیش و عشرت سے تعبیر کرتے ہیں —— اور عیش و عشرت کا مطلب عام طور پر جسمانی لذت ہوتا ہے۔

جسمانی لذت کیا ہے۔۔۔؟ ایک وقتی حظ جو ہمیں اپنی بیوی یا کسی اور عورت کی مدد سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ شادی شدہ مرد اپنی بیویاں چھوڑ کر اس وقتی لذت کے لیے بازاری عورتوں کے پاس کیوں جاتے ہیں؟ جب ان لوگوں کی جسمانی خواہشات گھر میں پوری ہو سکتی ہیں تو وہ اس کے لیے باہر کیوں مارے مارے پھرتے ہیں —— اس سوال کا جواب مشکل نہیں۔ آپ کو ایسے کئی آدمی نظر آئیں گے جو گھر کے مرغن اور لذیذ کھانے چھوڑ کر ہوٹلوں میں جاتے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کو ہوٹلوں کے کھانے کی چاٹ پڑ جاتی ہے۔ ہوٹل کی چیزوں میں غذائیت کم ہوتی ہے مگر ان میں ایک اور شے ہوتی ہے جو ان لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے اسے ہم "ہوٹلیت" کہتے ہیں۔ ایک ایسی برائی جو وصف بن جاتی ہے بلکہ یوں کہیے کہ ایک کشش بن جاتی ہے۔ اس میں ہوٹل کے مالکوں کے فن کا بھی دخل ہوتا ہے —— اس کے علاوہ جو ماحول ہوٹل میں میسر آسکتا ہے، وہ انھیں اپنے گھر میں نصیب نہیں ہو سکتا۔ انسان طبعاً تنوع پسند ہے، اس لیے جب وہ اپنے روزمرہ کے پروگرام میں تبدیلی چاہے تو تعجب نہ ہونا چاہیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہوٹلوں میں ان لوگوں کو اچھا کھانا نہیں مل سکتا اور اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ یہاں گھر کی بہ نسبت زیادہ خرچ برداشت کرنا پڑتا ہے مگر یہی چیز تو یہ لوگ چاہتے ہیں۔ یہی فرق تو انھیں گھر سے کھینچ کر ہوٹلوں میں لاتا ہے۔ یہ نادانی ہے مگر لطف کی بات یہ ہے کہ انھیں اسی نادانی میں مزہ آتا ہے۔

ان شادی شدہ مردوں کا بھی یہی حال ہے جو اپنی بیویاں چھوڑ کر بازاری عورتوں کی آغوش میں لذت تلاش کرنے آتے ہیں۔ اب آپ پوچھیں گے کہ آیا ان لوگوں کو اس تلاش میں کامیابی ہوتی ہے۔۔۔؟ ہم کہیں گے، یقیناً —— جن عورتوں کے پاس یہ لوگ جاتے ہیں، وہ اس فن کی ماہر ہوتی ہیں۔ وہ یہی چیز تو بیچتی ہیں۔ ان کا پیشہ ہی یہ ہے کہ گھریلو عورتوں سے بالکل مختلف رنگ کی لذت پیش کریں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو ان کا کاروبار کیسے چلے؟

جیسا کہ ہم اس مقالے کے آغاز میں کہہ چکے ہیں، عصمت فروشی خلافِ عقل چیز نہیں۔۔۔

مملکتِ خداداد

ایک

ٹھنڈا گوشت
کھول دو

زحمتِ مہرِ درخشاں

تعطّل
ہائی کورٹ ججمنٹ
پس منظر

دو

اوپر، نیچے اور درمیان
یہ افسانہ

پانچواں مقدمہ : ایک
پانچواں مقدمہ : دو
پانچواں مقدمہ : تین

آخری خط

ٹھنڈا گوشت

ایشر سنگھ جونہی ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوا، کلونت کور پلنگ پر سے اُٹھی۔ اپنی تیز تیز آنکھوں سے اس کی طرف گھور کے دیکھا اور دروازے کی چٹخنی بند کردی۔ رات کے بارہ بج چکے تھے، شہر کا مضافات ایک عجیب پُراسرار خاموشی میں غرق تھا۔

کلونت کور پلنگ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ ایشر سنگھ جو غالباً اپنے پراگندہ خیالات کے اُلجھے ہوئے دھاگے کھول رہا تھا، ہاتھ میں کرپان لیے ایک کونے میں کھڑا تھا۔ چند لمحات اسی طرح خاموشی میں گزر گئے۔ کلونت کور کو تھوڑی دیر کے بعد اپنا آسن پسند نہ آیا، اور وہ دونوں ٹانگیں پلنگ سے نیچے لٹکا کر ہلانے لگی۔ ایشر سنگھ پھر بھی کچھ نہ بولا۔

کلونت کور بھرے بھرے ہاتھ پیروں والی عورت تھی۔ چوڑے چکلے کولھے تھل تھل کرنے والے گوشت سے بھرپور، کچھ بہت ہی زیادہ اوپر کو اُٹھا ہوا سینہ، تیز آنکھیں، بالائی ہونٹ پر بالوں کا سُرمئی غبار۔ ٹھوڑی کی ساخت سے پتہ چلتا تھا کہ بڑے دھڑلے کی عورت ہے۔

ایشر سنگھ سر نیوڑھائے ایک کونے میں چپ چاپ کھڑا تھا۔ سر پر اُس کی کس کر باندھی ہوئی پگڑی ڈھیلی ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ جو کرپان تھامے ہوئے تھے، تھوڑے تھوڑے لرزاں تھے مگر اس کے قدوقامت اور

خدوخال سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کلونت کور جیسی عورت کے لیے موزوں ترین مرد ہے۔

چند اور لمحات جب اسی طرح خاموشی میں گزر گئے تو کلونت کور چھلک پڑی لیکن تیز تیز آنکھوں کو نچا کر وہ صرف اس قدر کہہ سکی: ”ایشر سیاں . . .“

ایشر سنگھ نے گردن اُٹھا کر کلونت کور کی طرف دیکھا مگر اس کی نگاہوں کی گولیوں کی تاب نہ لا کر منہ دوسری طرف موڑ لیا۔

کلونت کور چلّائی: ”ایشر سیاں . . .“ لیکن فوراً ہی آواز بھینچ لی اور پلنگ پر سے اُٹھ کر اس کی جانب جاتے ہوئے بولی: ”کہاں رہے تم اتنے دن؟“

ایشر سنگھ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری: ”مجھے معلوم نہیں۔“

کلونت کور بھنّا گئی: ”یہ بھی کوئی ماں یا جواب ہے!“

ایشر سنگھ نے کرپان ایک طرف پھینک دی اور پلنگ پر لیٹ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کئی دنوں کا بیمار ہے۔ کلونت کور نے پلنگ کی طرف دیکھا جو اب ایشر سنگھ سے لبالب بھرا تھا۔ اس کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ چنانچہ اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اس نے بڑے پیار سے پوچھا: ”جانی کیا ہوا ہے تمھیں؟“

ایشر سنگھ چھت کی طرف دیکھ رہا تھا، اُس سے نگاہیں ہٹا کر اس نے کلونت کور کے مانوس چہرے کو ٹٹولنا شروع کیا: ”کلونت!“ اس کی آواز میں درد تھا۔

کلونت کور ساری سمٹ کر اپنے بالائی ہونٹ میں آ گئی۔ ”ہاں جانی“ کہہ کر وہ اس کو دانتوں سے کاٹنے لگی۔

ایشر سنگھ نے پگڑی اتار دی۔ کلونت کور کی طرف سہارا لینے والی نگاہوں سے دیکھا، اس کے گوشت بھرے کولہے پر زور سے دھپا مارا اور سر کو جھٹکا دے کر اپنے آپ سے کہا: ”یہ کڑی یا دماغ ہی خراب ہے . . .“

جھٹکا دینے سے اس کے کیس کھل گئے۔ کلونت کور انگلیوں سے ان میں کنگھی کرنے لگی۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے بڑے پیار سے پوچھا: ”ایشر سیاں، کہاں رہے تم اتنے دن؟“

”برے کی ماں کے گھر . . .“ ایشر سنگھ نے کلونت کور کو گھور کے دیکھا اور دفعتاً دونوں ہاتھوں سے اس کے اُبھرے ہوئے سینے کو مسلنے لگا: ”قسم واہگورو کی، بڑی جاندار عورت ہو۔“

کلونت کور نے ایک ادا کے ساتھ ایشر سنگھ کے ہاتھ ایک طرف جھٹک دیے اور پوچھا: ”تمھیں میری قسم، بتاؤ، کہاں رہے . . . ؟ شہر گئے تھے؟“

ایشر سنگھ نے ایک ہی لپیٹ میں اپنے بالوں کا جوڑا بناتے ہوئے جواب دیا: ”نہیں۔“

کلونت کور چڑ گئی: ”نہیں تم ضرور شہر گئے تھے . . . اور تم نے بہت سا روپیہ لوٹا ہے جو تم مجھ سے چھپا رہے ہو۔“

”وہ اپنے باپ کا تخم نہ ہو جو تم سے جھوٹ بولے . . .“

کلونت کور تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئی لیکن فوراً ہی بھڑک اُٹھی: ”لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا، اس رات تمھیں ہوا کیا . . . ؟ اچھے بھلے میرے ساتھ لیٹے تھے، مجھے تم نے وہ تمام گہنے پہنا رکھے تھے جو شہر سے لوٹ کے لائے تھے۔ میری بھپیاں لے رہے تھے، پر جانے ایک دم تمھیں کیا ہوا، اُٹھے اور کپڑے

پہن کر باہر نکل گئے ۔ ۔ ۔"

ایشر سنگھ کا رنگ زرد ہو گیا۔ کلونت کور نے یہ تبدیلی دیکھتے ہی کہا: "دیکھا کیسے رنگ پیلا پڑ گیا ۔ ۔ ۔ ایشر سیاں، قسم واہگورو کی، ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔"

"تیری جان کی قسم، کچھ بھی نہیں۔"

ایشر سنگھ کی آواز بے جان تھی۔ کلونت کور کا شبہ اور زیادہ مضبوط ہو گیا۔ بالائی ہونٹ بھینچ کر اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا: "ایشر سیاں، کیا بات ہے۔ تم وہ نہیں ہو جو آج سے آٹھ روز پہلے تھے؟"

ایشر سنگھ ایک دم اٹھ بیٹھا جیسے کسی نے اس پر حملہ کیا ہے۔ کلونت کور کو اپنے تنومند بازوؤں میں سمیٹ کر اس نے پوری قوت کے ساتھ اسے بھنبھوڑنا شروع کر دیا: "جانی، میں وہی ہوں ۔ ۔ ۔ گھٹ گھٹ پا جپھیاں، تیری نکلے ہڈاں دی گرمی ۔ ۔ ۔"

کلونت کور نے کوئی مزاحمت نہ کی، لیکن وہ شکایت کرتی رہی: "تمھیں اس رات ہو کیا گیا تھا؟"

"برے کی ماں کا وہ ہو گیا تھا۔"

"بتاؤ گے نہیں؟"

"کوئی بات ہو تو بتاؤں۔"

"مجھے اپنے ہاتھوں سے جلاؤ اگر جھوٹ بولو۔"

ایشر سنگھ نے اپنے بازو اس کی گردن میں ڈال دیے اور ہونٹ اس کے ہونٹوں میں گاڑ دیے۔ مونچھوں کے بال کلونت کور کے نتھنوں میں گھسے تو اسے چھینک آ گئی ——— دونوں ہنسنے لگے۔

ایشر سنگھ نے اپنی صدری اتار دی اور کلونت کور کو شہوت بھری نظروں سے دیکھ کر کہا: "آجاؤ ایک بازی تاش کی ہو جائے!"

کلونت کور کے بالائی ہونٹ پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں پھوٹ آئیں۔ ایک ادا کے ساتھ اس نے اپنی آنکھوں کی پتلیاں گھمائیں اور کہا: "چل دفان ہو ۔ ۔ ۔"

ایشر سنگھ نے اس کے بھرے ہوئے کولھے پر زور سے چٹکی بھری۔ کلونت کور تڑپ کر ایک طرف ہٹ گئی: "نہ کر ایشر سیاں، میرے درد ہوتا ہے ۔ ۔ ۔"

ایشر سنگھ نے آگے بڑھ کر کلونت کور کا بالائی ہونٹ اپنے دانتوں تلے دبا لیا اور کچکچانے لگا۔ کلونت کور بالکل پگھل گئی۔ ایشر سنگھ نے اپنا کرتا اتار کے پھینک دیا اور کہا: "لو، پھر ہو جائے ترپ چال ۔ ۔ ۔"

کلونت کور کا بالائی ہونٹ کپکپانے لگا، ایشر سنگھ نے دونوں ہاتھوں سے کلونت کور کی قمیص کا گھیرا پکڑا اور جس طرح بکرے کی کھال اتارتے ہیں، اسی طرح اس کو اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ پھر اس نے گھور کے اس کے ننگے بدن کو دیکھا اور زور سے اس کے بازو پر چٹکی بھرتے ہوئے کہا: "کلونت، قسم واہگورو کی، بڑی کراری عورت ہے تو ۔ ۔ ۔"

کلونت کور اپنے بازو پر ابھرتے ہوئے لال دھبے کو دیکھنے لگی: "بڑا ظالم ہے تو ایشر سیاں؟"

ایشر سنگھ اپنی گھنی کالی مونچھوں میں مسکرایا: "ہونے دے آج ظلم" اور یہ کہہ کر اس نے مزید ظلم ڈھانے شروع کیے ——— کلونت کور کا بالائی ہونٹ دانتوں تلے کچکچایا، کان کی لووں کو کاٹا، ابھرے ہوئے

سینے کو بھنبھوڑا، بھرے ہوئے کولھوں پر آواز پیدا کرنے والے چانٹے مارے، گالوں کے منہ بھر بھر کے بوسے لیے، چوس چوس کر اُس کا سارا سینہ تھوکوں سے لتھیڑ دیا ——— کلونت کور تیز آنچ پر چڑھی ہوئی ہانڈی کی طرح اُبلنے لگی لیکن ایشر سنگھ ان تمام حیلوں کے باوجود خود میں حرارت پیدا نہ کر سکا۔ جتنے گُر اور جتنے داؤ اُسے یاد تھے، سب کے سب اس نے پٹ جانے والے پہلوان کی طرح استعمال کر دیے، پر کوئی کارگر نہ ہوا۔ کلونت کور نے جس کے بدن کے سارے تار تن کر خود بخود بج رہے تھے، غیر ضروری چھیڑ چھاڑ سے تنگ آکر کہا: "ایشر سیاں، کافی پھینٹ چکا ہے، اب پتّا پھینک!"

یہ سنتے ہی ایشر سنگھ کے ہاتھ سے جیسے تاش کی ساری گڈی نیچے پھسل گئی۔ ہانپتا ہوا وہ کلونت کور کے پہلو میں لیٹ گیا اور اُس کے ماتھے پر سرد پسینے کے لیپ ہونے لگے۔ کلونت کور نے اسے گرمانے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہی۔ اب تک سب کچھ منہ سے کہے بغیر ہوتا رہا تھا لیکن جب کلونت کور کے منتظر بہ عمل اعضا کو سخت ناامیدی ہوئی تو وہ جھلا کر پلنگ سے نیچے اُتر گئی۔ سامنے کھونٹی پر چادر پڑی تھی، اس کو اُتار کر اس نے جلدی جلدی اوڑھ کر اور نتھنے پھلا کر، بپھرے ہوئے لہجے میں کہا: "ایشر سیاں وہ کون حرامزادی ہے جس کے پاس تو اتنے دن رہ کر آیا ہے اور جس نے تجھے نچوڑ ڈالا ہے؟"

ایشر سنگھ پلنگ پر لیٹا ہانپتا رہا اور اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

کلونت کور غصے سے اُبلنے لگی: "میں پوچھتی ہوں، کون ہے وہ چڈّو۔ ۔ ۔ کون ہے وہ الفتی۔ ۔ ۔ کون ہے وہ چور پتّا؟"

ایشر سنگھ نے تھکے ہوئے لہجے میں جواب دیا: "کوئی بھی نہیں کلونت! کوئی بھی نہیں۔ ۔ ۔"

کلونت کور نے اپنے بھرے ہوئے کولھوں پر ہاتھ رکھ کر ایک عزم کے ساتھ کہا: "ایشر سیاں، میں آج جھوٹ سچ جان کے رہوں گی۔ ۔ ۔ کھا واہگورو جی کی قسم۔ ۔ ۔
کیا اس کی تہہ میں کوئی عورت نہیں؟"

ایشر سنگھ نے کچھ کہنا چاہا مگر کلونت کور نے اس کی اجازت نہ دی: "قسم کھانے سے پہلے سوچ لے کہ میں بھی سردار نہال سنگھ کی بیٹی ہوں۔ ۔ ۔ تکا بوٹی کر دوں گی، اگر تو نے جھوٹ بولا۔ ۔ ۔ لے اب کھا واہگورو جی کی قسم۔ ۔ ۔ کیا اس کی تہہ میں کوئی عورت نہیں۔ ۔ ۔؟"

ایشر سنگھ نے بڑے دُکھ کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔ کلونت کور بالکل دیوانی ہو گئی۔ اس نے لپک کر کونے میں سے کرپان اُٹھائی، میان کو کیلے کے چھلکے کی طرح اُتار کر ایک طرف پھینکا اور ایشر سنگھ پر وار کر دیا۔

آن کی آن میں لہو کے فوارے چھوٹ پڑے۔ کلونت کور کی اس سے بھی تسلی نہ ہوئی تو اس نے وحشی بلیوں کی طرح ایشر سنگھ کے کیس نوچنے شروع کر دیے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی نامعلوم سوت کو موٹی موٹی گالیاں دیتی رہی۔ ایشر سنگھ نے تھوڑی دیر کے بعد نقاہت بھری التجا کی: "جانے دے اب کلونت، جانے دے۔ ۔ ۔!"
اس کی آواز میں بلا کا درد تھا۔ کلونت کور پیچھے ہٹ گئی۔

خون ایشر سنگھ کے گلے سے اُڑ اُڑ کر اس کی مونچھوں پر گر رہا تھا۔ اس نے اپنے لرزاں ہونٹ کھولے اور کلونت کور کی طرف شکریے اور گلے کی ملی جلی نگاہوں سے دیکھا: "میری جان! تم نے بہت جلدی کی۔ ۔ ۔ لیکن جو ہوا، ٹھیک ہے۔ ۔ ۔"

سینے کو بھنجوڑا، بھرے ہوئے کولھوں پر آواز پیدا کرنے والے چانٹے مارے، گالوں کے منہ بھر بھر کے بوسے لیے، چوس چوس کر اس کا سارا سینہ تھوکوں سے لتھیڑ دیا ——— کلونت کور تیز آنچ پر چڑھی ہوئی ہانڈی کی طرح ابلنے لگی لیکن ایشر سنگھ ان تمام حیلوں کے باوجود خود میں حرارت پیدا نہ کرسکا۔ جتنے گر اور جتنے داؤ اسے یاد تھے، سب کے سب اس نے پٹ جانے والے پہلوان کی طرح استعمال کر دیے، پر کوئی کارگر نہ ہوا۔ کلونت کور نے جس کے بدن کے سارے تار تن کر خود بخود بج رہے تھے، غیر ضروری چھیڑ چھاڑ سے تنگ آکر کہا: "ایشر سیاں، کافی پھینٹ چکا ہے، اب پتا پھینک!"

یہ سنتے ہی ایشر سنگھ کے ہاتھ سے جیسے تاش کی ساری گڈی نیچے پھسل گئی۔ ہانپتا ہوا وہ کلونت کور کے پہلو میں لیٹ گیا اور اس کے ماتھے پر سرد پسینے کے لیپ ہونے لگے۔ کلونت کور نے اسے گرمانے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہی۔ اب تک سب کچھ منہ سے کہے بغیر ہوتا رہا تھا لیکن جب کلونت کور کے منتظر بہ عمل اعضا کو سخت ناامیدی ہوئی تو وہ جھلا کر پلنگ سے نیچے اتر گئی۔ سامنے کھونٹی پر چادر پڑی تھی، اس کو اتار کر اس نے جلدی جلدی اوڑھ کر اور نتھنے پھلا کر، بپھرے ہوئے لہجے میں کہا: "ایشر سیاں وہ کون حرامزادی ہے جس کے پاس تو اتنے دن رہ کر آیا ہے اور جس نے تجھے نچوڑ ڈالا ہے؟"

ایشر سنگھ پلنگ پر لیٹا ہانپتا رہا اور اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

کلونت کور غصے سے ابلنے لگی: "میں پوچھتی ہوں، کون ہے وہ چڈو . . . کون ہے وہ الفتی . . . کون ہے وہ چور پتا؟"

ایشر سنگھ نے تھکے ہوئے لہجے میں جواب دیا: "کوئی بھی نہیں کلونت! کوئی بھی نہیں . . ."

کلونت کور نے اپنے بھرے ہوئے کولھوں پر ہاتھ رکھ کر ایک عزم کے ساتھ کہا: "ایشر سیاں، میں آج جھوٹ سچ جان کے رہوں گی . . . کھا واہگورو جی کی قسم . . . کیا اس کی تہہ میں کوئی عورت نہیں؟"

ایشر سنگھ نے کچھ کہنا چاہا مگر کلونت کور نے اس کی اجازت نہ دی: "قسم کھانے سے پہلے سوچ لے کہ میں بھی سردار نہال سنگھ کی بیٹی ہوں . . . تکا بوٹی کر دوں گی، اگر تو نے جھوٹ بولا . . . لے اب کھا واہگورو جی کی قسم . . . کیا اس کی تہہ میں کوئی عورت نہیں . . . ؟"

ایشر سنگھ نے بڑے دکھ کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔ کلونت کور بالکل دیوانی ہو گئی۔ اس نے لپک کر کونے میں سے کرپان اٹھائی، میان کو کیلے کے چھلکے کی طرح اتار کر ایک طرف پھینکا اور ایشر سنگھ پر وار کر دیا۔

آن کی آن میں لہو کے فوارے چھوٹ پڑے۔ کلونت کور کی اس سے بھی تسلی نہ ہوئی تو اس نے وحشی بلیوں کی طرح ایشر سنگھ کے کیس نوچنے شروع کر دیے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی نامعلوم سوت کو موٹی موٹی گالیاں دیتی رہی۔ ایشر سنگھ نے تھوڑی دیر کے بعد نقاہت بھری التجا کی: "جانے دے اب کلونت، جانے دے . . .!"

اس کی آواز میں بلا کا درد تھا۔ کلونت کور پیچھے ہٹ گئی۔

خون ایشر سنگھ کے گلے سے اڑ اڑ کر اس کی مونچھوں پر گر رہا تھا۔ اس نے اپنے لرزاں ہونٹ کھولے اور کلونت کور کی طرف شکریے اور گلے کی ملی جلی نگاہوں سے دیکھا: "میری جان! تم نے بہت جلدی کی . . . لیکن جو ہوا، ٹھیک ہے . . . !"

کلونت کور کا حسد بھڑک اٹھا: "مگر وہ کون ہے تمھاری ماں؟"

لہو ایشر سنگھ کی زبان تک پہنچ گیا۔ جب اس نے اس کا ذائقہ چکھا تو اس کے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ "اور میں . . . اور میں . . . . . . بھینی یا چھ آدمیوں کو قتل کر چکا ہوں . . . اسی کرپان سے . . ."

کلونت کور کے دماغ میں صرف دوسری عورت تھی: "میں پوچھتی ہوں، کون ہے وہ حرامزادی؟"

ایشر سنگھ کی آنکھیں دھندلا رہی تھیں۔ ایک ہلکی سی چمک ان میں پیدا ہوئی اور اس نے کلونت کور سے کہا: "گالی نہ دے اُس بھڑوی کو . . ."

کلونت چلّائی: "میں پوچھتی ہوں، وہ ہے کون؟"

ایشر سنگھ کے گلے میں آواز رُندھ گئی: "بتاتا ہوں . . ." یہ کہہ کر اُس نے اپنی گردن پر ہاتھ پھیرا اور اس پر اپنا جیتا جیتا خون دیکھ کر مسکرایا: "انسان ماں یا بھی ایک عجیب چیز ہے . . ."

کلونت کور اس کے جواب کی منتظر تھی: "ایشر سیاں، تو مطلب کی بات کر . . ."

ایشر سنگھ کی مسکراہٹ اس کی بھری مونچھوں میں اور زیادہ پھیل گئی: "مطلب ہی کی بات کر رہا ہوں . . . گلا چرا ہے ماں یا میرا . . . اب دھیرے دھیرے ہی ساری بات بتاؤں گا . . ."

اور جب وہ بات بتانے لگا تو اس کے ماتھے پر ٹھنڈے پسینے کے لیپ ہونے لگے: "کلونت میری جان! میں تمھیں نہیں بتا سکتا، میرے ساتھ کیا ہوا . . . ؟ انسان کڑی یا بھی ایک عجیب چیز ہے . . . شہر میں لوٹ مچی تو سب کی طرح میں نے بھی اس میں حصہ لیا . . . گہنے پاتے اور روپے پیسے جو بھی ہاتھ لگے، وہ میں نے تمھیں دے دیے . . . لیکن ایک بات تمھیں نہ بتائی . . ."

ایشر سنگھ نے گھاؤ میں درد محسوس کیا اور کراہنے لگا۔ کلونت کور نے اس کی طرف توجہ نہ دی اور بڑی بے رحمی سے پوچھا: "کون سی بات؟"

ایشر سنگھ نے مونچھوں پر جمتے ہوئے لہو کو پھونک کے ذریعے اُڑاتے ہوئے کہا: "جس مکان پر . . . میں نے دھاوا بولا تھا . . . اس میں سات . . . اس میں سات آدمی تھے . . . چھ میں نے . . . قتل کر دیے . . . اسی کرپان سے جس سے تو نے مجھے . . . چھوڑ اسے . . . سن . . . ایک لڑکی تھی بہت ہی سُندر . . . اس کو اُٹھا کر میں اپنے ساتھ لے آیا . . ."

کلونت کور خاموش سنتی رہی۔ ایشر سنگھ نے ایک بار پھر پھونک مار کے مونچھوں پر سے لہو اُڑایا: "کلونت جانی، میں تم سے کیا کہوں، کتنی سُندر تھی . . . میں اسے بھی مار ڈالتا، پر میں نے کہا، نہیں ایشر سیاں، کُلونت کور کے تو ہر روز مزے لیتا ہے، یہ میوہ بھی چکھ دیکھ . . ."

کلونت کور نے صرف اس قدر کہا: "ہوں . . . !"

". . . اور میں اسے کندھے پر ڈال کر چل دیا . . . راستے میں . . . کیا کہہ رہا تھا میں . . . ؟ ہاں راستے . . . نہر کی پٹڑی کے پاس تھوہر کی جھاڑیوں تلے میں نے اسے لٹا دیا . . . پہلے سوچا کہ پھینٹوں، لیکن پھر خیال آیا کہ نہیں . . ." یہ کہتے کہتے ایشر سنگھ کی زبان سوکھ گئی۔

کلونت کور نے تھوک نگل کر اپنا حلق تر کیا اور پوچھا: "پھر کیا ہوا؟"

ایشر سنگھ کے حلق سے بمشکل یہ الفاظ نکلے: "میں نے . . . میں نے پتا پھینکا . . لیکن . . . لیکن . . ." اس کی آواز ڈوب گئی۔

کلونت کور نے اسے جھنجھوڑا: "پھر کیا ہوا؟"

ایشر سنگھ نے اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھیں کھولیں اور کلونت کور کے جسم کی طرف دیکھا جس کی بوٹی بوٹی تھرک رہی تھی: "وہ . . . وہ مری ہوئی تھی . . . لاش تھی . . . بالکل ٹھنڈا گوشت . . . جانی، مجھے اپنا ہاتھ دے . . ."

کلونت کور نے اپنا ہاتھ ایشر سنگھ کے ہاتھ پر رکھا جو برف سے بھی زیادہ ٹھنڈا تھا۔

کھول دو

امرتسر سے اسپیشل ٹرین دوپہر کے دو بجے چلی اور آٹھ گھنٹوں کے بعد مغل پورہ پہنچی —— راستے میں کئی آدمی مارے گئے، متعدد زخمی ہوئے اور کچھ ادھر اُدھر بھٹک گئے۔

صبح دس بجے کیمپ کی ٹھنڈی زمین پر جب سراج الدین نے آنکھیں کھولیں اور اپنے چاروں طرف مردوں اور بچوں کا متلاطم سمندر دیکھا تو اس کے سوچنے سمجھنے کی قوتیں اور بھی ضعیف ہوگئیں اور وہ دیر تک گدلے آسمان کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا —— یوں تو کیمپ میں ہر طرف شور برپا تھا لیکن بوڑھے سراج الدین کے کان جیسے بند تھے۔ اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ کوئی اسے دیکھتا تو یہی خیال کرتا کہ وہ کسی گہری فکر میں ہے —— مگر اس کے ہوش و حواس شل تھے۔ اس کا سارا وجود خلا میں معلق تھا۔

گدلے آسمان کی طرف بغیر کسی ارادے کے دیکھتے دیکھتے سراج الدین کی نگاہیں سورج سے ٹکرائیں تو تیز روشنی اس کے وجود کے سارے ریشوں میں اتر گئی اور وہ جاگ اُٹھا۔ اوپر تلے اس کے ذہن میں کئی تصویریں دوڑ گئیں: لوٹ، آگ . . . بھاگم بھاگ . . . اسٹیشن . . . گولیاں . . . رات اور سکینہ . . .

سراج الدین اک دم کھڑا ہوگیا اور پھر اس نے پاگلوں کی طرح اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے انسانوں

کے سمندر کو کھنگالنا شروع کیا۔

پورے تین گھنٹے وہ "سکینہ۔۔۔سکینہ۔۔۔" پکارتا کیمپ کی خاک چھانتا رہا مگر اسے اپنی جوان اکلوتی بیٹی کا کوئی پتہ نہ چلا —— چاروں طرف اک دھاندلی سی مچی ہوئی تھی۔ کوئی اپنا بچہ ڈھونڈ رہا تھا، کوئی ماں، کوئی بیوی اور کوئی بیٹی۔

سراج الدین تھک ہار کر ایک طرف بیٹھ گیا اور اپنے حافظے پر زور دے کر سوچنے لگا کہ سکینہ اس سے کب اور کہاں جدا ہوئی، لیکن سوچتے ہوئے اس کا دھیان سکینہ کی ماں کی لاش پر جم گیا جس کی ساری انتڑیاں باہر نکلی ہوئی تھیں —— وہ اس سے آگے کچھ اور سوچ نہ سکا۔

سکینہ کی ماں مر چکی تھی۔ اس نے سراج الدین کی آنکھوں کے سامنے دم توڑا تھا —— لیکن سکینہ کہاں ہے جس کے متعلق اس کی ماں نے مرتے ہوئے کہا تھا: "۔۔۔مجھے چھوڑو، فوراً سکینہ کو لے کر یہاں سے بھاگ جاؤ۔۔۔"

سکینہ اس کے ساتھ ہی تھی —— اور وہ دونوں ننگے پاؤں بھاگ رہے تھے۔ سکینہ کا دوپٹہ گر پڑا تھا۔ دوپٹہ اٹھانے کے لیے اس نے رکنا چاہا تھا اور سکینہ نے چلا کر کہا تھا: "۔۔۔اباجی، چھوڑیے۔۔۔!" لیکن اس نے دوپٹہ اٹھا لیا تھا —— یہ دھیان آتے ہی اس نے اپنے کوٹ کی ابھری ہوئی جیب کی طرف دیکھا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر دوپٹہ نکالا، سکینہ کا وہی دوپٹہ —— لیکن سکینہ کہاں ہے؟

سراج الدین نے اپنے تھکے ہوئے ذہن پر بہت زور ڈالا مگر وہ کسی نتیجے تک نہ پہنچ سکا: کیا وہ سکینہ کو اپنے ساتھ اسٹیشن تک لے آیا تھا؟ کیا وہ اس کے ساتھ گاڑی میں سوار ہوئی تھی؟ کیا راستے میں گاڑی کے رکنے پر اور بلوائیوں کے گاڑی میں گھس آنے پر وہ بیہوش ہو گیا تھا جو وہ سکینہ کو اٹھا کر لے گئے۔۔۔؟

سراج الدین کے ذہن میں سوال ہی سوال تھے، جواب کوئی نہ تھا —— سراج الدین کو ہمدردی کی ضرورت تھی لیکن چاروں طرف جتنے بھی انسان پھیلے ہوئے تھے، سب کو ہمدردی کی ضرورت تھی —— اس نے رونا چاہا مگر اس کی آنکھوں نے اس کی مدد نہ کی۔ آنسو نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔

چھ روز کے بعد سراج الدین کے ہوش و حواس کسی طرح درست ہوئے تو وہ ان لوگوں سے ملا جو اس کی مدد کرنے کو تیار تھے —— وہ آٹھ نوجوان تھے۔ ان کے پاس لاری تھی، بندوقیں تھیں۔

اس نے ان کو لاکھ لاکھ دعائیں دیں اور سکینہ کا حلیہ بتایا: "گورا رنگ ہے اس کا اور بہت ہی خوبصورت ہے وہ۔۔۔مجھ پر نہیں ہے، اپنی ماں پر ہے۔۔۔عمر سترہ برس کے قریب ہے۔۔۔آنکھیں بڑی بڑی، بال سیاہ، داہنے گال پر موٹا سا تل۔۔۔میری اکلوتی لڑکی ہے۔۔۔ڈھونڈ لاؤ اسے، خدا تمہارا بھلا کرے گا۔۔۔"

رضاکار نوجوان نے بڑے جذبے کے ساتھ بوڑھے سراج الدین کو یقین دلایا کہ اگر اس کی بیٹی زندہ ہے تو چند ہی دنوں میں وہ اس کے پاس ہوگی۔

آٹھوں نوجوانوں نے کوشش کی۔ جان ہتھیلی پر رکھ کر وہ امرتسر گئے۔ کئی عورتوں، کئی مردوں اور کئی بچّوں کو نکال نکال کر انھوں نے محفوظ مقاموں پر پہنچایا — لیکن دس روز گزر جانے پر بھی انھیں سکینہ کہیں نہ ملی۔

ایک روز وہ پھر اسی خدمت کے لیے لاری پر امرتسر جا رہے تھے کہ چھیہرٹے کے پاس سڑک پر انھیں ایک لڑکی دکھائی دی — لاری کی آواز سُن کر وہ بدکی اور اس نے بھاگنا شروع کر دیا۔

رضاکاروں نے لاری روکی اور سب کے سب اس کے پیچھے بھاگے۔

ایک کھیت میں انھوں نے لڑکی کو پکڑ لیا — لڑکی خوبصورت تھی۔ داہنے گال پر موٹا سا تل تھا۔

ایک نوجوان نے لڑکی سے کہا: "گھبراؤ نہیں . . . کیا تمھارا نام سکینہ ہے . . . ؟"

لڑکی کا رنگ اور زرد ہو گیا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ جب تمام نوجوانوں نے اسے دم دلاسا دیا تو لڑکی کی وحشت دُور ہوئی اور اس نے مان لیا کہ وہ سراج الدین کی بیٹی سکینہ ہے۔

آٹھوں رضاکار نوجوانوں نے ہر طرح سکینہ کی دلجوئی کی: اسے کھانا کھلایا، دودھ پلایا، لاری میں بٹھایا — ایک نے اپنا کوٹ اتار کر اسے دیا کیونکہ دوپٹہ نہ ہونے کے باعث وہ بہت الجھن محسوس کر رہی تھی۔ وہ بار بار بانہوں سے اپنے سینے کو ڈھانپنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

کئی دن گزر گئے — سراج الدین کو سکینہ کی کوئی خبر نہ ملی۔

وہ دن بھر مختلف کیمپوں اور دفتروں کے چکر کاٹتا رہتا لیکن کہیں بھی اسے بیٹی کا پتہ نہ چلتا۔ رات کو وہ دیر تک ان رضاکار نوجوانوں کی کامیابی کے لیے دعائیں مانگتا رہتا، جنھوں نے اسے یقین دلایا تھا کہ اگر اس کی بیٹی زندہ ہے تو چند ہی دنوں میں وہ اس کے پاس ہوگی . . .

ایک دن سراج الدین نے کیمپ میں ان رضاکار نوجوانوں کو دیکھا — وہ لاری میں بیٹھے ہوئے تھے۔

وہ بھاگا بھاگا ان کے پاس گیا — لاری چلنے ہی والی تھی کہ اس نے پوچھا: "بیٹا . . . میری سکینہ کا پتہ چلا . . . ؟"

سب نے ایک زبان ہو کر کہا: "چل جائے گا، چل جائے گا . . ." اور لاری چل پڑی۔

اس نے ایک بار پھر ان نوجوانوں کی کامیابی کی دعا مانگی — اور یوں اس کا جی کسی قدر ہلکا ہو گیا۔

اسی شام کیمپ میں جہاں سراج الدین بیٹھا ہوا تھا، اس کے پاس ہی کچھ گڑبڑ ہوئی — چار آدمی کچھ اٹھا کر لا رہے تھے۔

اس نے دریافت کیا تو اسے معلوم ہوا کہ ایک لڑکی ریلوے لائن کے پاس بیہوش پڑی تھی، لوگ اسے

اٹھاکر لارہے ہیں۔

وہ ان کے پیچھے پیچھے ہولیا۔

ان لوگوں نے لڑکی کو ہسپتال کے سپرد کیا اور چلے گئے۔

وہ کچھ دیر تک ایسے ہی ہسپتال کے باہر گڑے ہوئے لکڑی کے کھمبے کے ساتھ لگ کر کھڑا رہا، پھر آہستہ آہستہ اندر چلا گیا۔

ایک کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا، بس ایک اسٹریچر تھا جس پر ایک لاش پڑی تھی۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا ہوا بڑھا۔

کمرے میں دفعتاً روشنی ہوئی۔

اس نے لاش کے زرد چہرے پر چمکتا ہوا تل دیکھا ——— اور چلایا: "سکینہ . . . !"

ڈاکٹر نے، جس نے کمرے میں روشنی کی تھی، اس سے پوچھا: "کیا ہے؟"

اس کے حلق سے صرف اتنا نکل سکا: "جی میں . . . جی میں اس کا باپ ہوں . . ."

ڈاکٹر نے اسٹریچر پر پڑی ہوئی لاش کی طرف دیکھا، پھر لاش کی نبض ٹٹولی اور اس سے کہا: "کھڑکی کھول دو . . ."

مردہ جسم میں جنبش ہوئی ———

بے جان ہاتھوں نے ازار بند کھولا ———

اور شلوار نیچے سرکا دی ———

بوڑھا سراج الدین خوشی سے چلایا: "زندہ ہے . . . میری بیٹی زندہ ہے . . ."

ڈاکٹر سر سے پیر تک پسینے میں غرق ہو چکا تھا۔

لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم جو ہو خارِ بیاباں پر

غالبؔ

زحمتِ مہرِ درخشاں

پٹانگ چیزیں لکھ لکھ کر تنگ آ گئے تھے، ریڈیو پاکستان، پشاور سے علیحدہ ہو کر لاہور چلے آئے اور انھوں نے "ادارہ فروغِ اردو" کے اشتراک سے ایک ماہنامہ پرچہ "نقوش" جاری کیا۔ ان کے اصرار کے باوجود میں "نقوش" کے پہلے چند پرچوں کے لیے کوئی کہانی نہ لکھ سکا۔ جب وہ ناراض ہو گئے تو میں نے پاکستان میں اپنا پہلا افسانہ "ٹھنڈا گوشت" لکھا۔

قاسمی صاحب نے یہ افسانہ میرے سامنے پڑھا۔ وہ خاموش پڑھتے رہے مگر مجھے ان کا ردِ عمل معلوم نہ ہو سکا۔ افسانہ ختم کرنے کے بعد انھوں نے مجھ سے معذرت بھرے لہجے میں کہا: "منٹو صاحب، معاف کیجیے، افسانہ بہت اچھا ہے لیکن 'نقوش' کے لیے بہت گرم ہے۔ . . ."

قاسمی صاحب سے کبھی بحث نہیں ہوئی تھی، اس لیے میں نے خاموشی سے افسانہ واپس لے لیا اور اُن سے کہا: "بہت بہتر، تو میں آپ کے لیے دوسرا افسانہ لکھ دوں گا۔ آپ کل شام تشریف لے آئیے گا۔"

قاسمی صاحب جب دوسرے روز شام کو تشریف لائے تو میں اپنے دوسرے افسانے "کھول دو" کی اختتامی سطور لکھ رہا تھا۔ میں نے قاسمی صاحب سے کہا: "چند منٹ . . . آپ بیٹھیے، میں افسانہ مکمل کر کے آپ کو دیتا ہوں۔"

اس افسانے کی اختتامی سطور چونکہ بہت ہی اہم تھیں، اس لیے قاسمی صاحب کو کافی دیر انتظار کرنا پڑا۔ جب افسانہ مکمل ہو گیا تو میں نے مسودہ ان کے حوالے کر دیا: "پڑھ لیجیے، خدا کرے آپ کو پسند آ جائے۔"

قاسمی صاحب نے افسانہ پڑھنا شروع کیا۔ اختتامی سطور پر پہنچے تو میں نے نوٹ کیا جیسے کسی نے ان کو جھنجھوڑ دیا ہے —— افسانہ ختم کرنے کے بعد وہ کچھ نہ بولے۔ میں نے اُن سے پوچھا: "کیسا ہے؟"

قاسمی صاحب پر افسانے کا اثر ابھی تک غالب تھا۔ انھوں نے مختصراً کہا: "اچھا ہے . . . میں لیے جاتا ہوں،" اور آپ رخصت لے کر چلے گئے۔

"کھول دو" قاسمی صاحب کے پرچے "نقوش ۳" میں شایع ہوا۔ قارئین نے پسند کیا۔ ہر ایک کا ردِ عمل یکساں تھا۔ آخری سطور سب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی تھیں لیکن ایک دم ہم سب کو جھنجھوڑ کر رکھ دینے والا حادثہ وقوع پذیر ہوا۔ حکومت کو یہ افسانہ امنِ عامہ کے مفاد کے منافی نظر آیا۔ چنانچہ حکم ہوا: "نقوش" کی اشاعت چھ مہینے تک بند رہے —— اخباروں میں حکومت کے اس اقدام کے خلاف احتجاجاً بہت کچھ لکھا گیا مگر امتناعی حکم اپنی جگہ پر قائم رہا۔

میں نے ایک روز قاسمی صاحب سے مسکرا کر کہا: "اگر آپ 'ٹھنڈا گوشت' شایع کرتے تو شاید یہ بجلی آپ کے آشیانے پر نہ گرتی۔"

کافی دن گزرنے پر "ادبِ لطیف" کے نائب مدیر میرے پاس آئے اور "ٹھنڈا گوشت" لے گئے —— افسانے کی کتابت ہو گئی، کاپیاں جم گئیں، پروف نکل آئے، غلطیاں درست کر کے جب واپس پریس میں گئیں تو کسی کی نظر "ٹھنڈا گوشت" والی کاپی پر پڑی۔ اُس نے افسانہ پڑھا تو چھاپنے سے انکار کر دیا —— قہرِ درویش برجانِ درویش، اس افسانے کے بغیر ہی پرچہ شایع کیا گیا۔

چودھری برکت علی صاحب کوئٹے میں تھے۔ واپس آئے تو انھوں نے "ادبِ لطیف" کے دوسرے شمارے میں "ٹھنڈا گوشت" چھپوانے کی کوشش کی مگر ناکام رہے —— افسانے کا مسودہ مجھے

واپس دے دیا گیا۔

اس دوران میں کراچی سے محترمہ ممتاز شیریں کے متعدد خط آچکے تھے کہ میں ان کے "نیا دور" کے لیے کوئی افسانہ بھیجوں۔ میں نے اُٹھا کر "ٹھنڈا گوشت" ان کو روانہ کر دیا۔ کافی دیر کے بعد جواب آیا کہ "ہم دیر تک سوچتے رہے کہ اسے شایع کیا جائے یا نہیں۔ افسانہ بہت اچھا ہے۔ مجھے بہت پسند ہے لیکن ڈر ہے کہ حکومت کے احتساب کے شکار نہ ہو جائیں ———" "ٹھنڈا گوشت" یہاں سے بھی ٹھنڈا ہو کر واپس میرے پاس پہنچ گیا۔ میں نے سوچا، اب اسے کسی رسالے میں نہیں چھپوانا چاہیے۔

چھ مہینے کی مدت پوری نہیں ہوئی تھی کہ حکومت نے "نقوش" پر سے "نہ چھاپو" والی قید ہٹا دی۔ چنانچہ میں نے "نیا ادارہ" کے لیے ایک مجموعہ مرتب کیا جس کا عنوان میں نے "نمرود کی خدائی" رکھا۔ اس میں "کھول دو" کے ساتھ میں نے "ٹھنڈا گوشت" بھی شامل کر دیا مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

عزیزی عارف عبدالمتین رسالہ "جاوید" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے تو میرے پیچھے پڑ گئے کہ میں ان کو "ٹھنڈا گوشت" کا مسودہ اشاعت کے لیے دوں۔ کافی دیر میں نے ٹال مٹول کی مگر آخر کار ان کے پیہم اصرار پر میں نے "نیا ادارہ" کے مالک چودھری نذیر احمد صاحب کو ایک چٹ لکھ دی: یہ "جاوید" والے اپنا پرچہ ضبط کرانا چاہتے ہیں، براہِ کرم ان کو "ٹھنڈا گوشت" کا مسودہ دے دیجیے۔

عارف صاحب افسانے کا مسودہ لے آئے اور انھوں نے اسے "جاوید" کے خاص نمبر مطبوعہ مارچ ۱۹۴۹ء میں شایع کر دیا۔

پرچہ چھپ کر مارکٹ میں آگیا۔ اندرونی اور بیرونی ایجنسیوں میں بھی تقسیم ہو گیا۔ یہاں تک تو خیریت رہی۔ ایک مہینہ گزر گیا۔ میں مطمئن ہو گیا کہ اب "ٹھنڈا گوشت" پر کوئی آفت نہیں آئے گی مگر پریس برانچ کی باگیں ابھی تک چودھری محمد حسین صاحب (اب مرحوم) کے ہاتھ میں تھیں۔ گو ضعیفی کے باعث ان کے ہاتھ بہت کمزور ہو چکے تھے مگر انھوں نے زور کا ایک جھٹکا دیا اور پولیس کی مشینری حرکت میں آگئی۔

میں نے ایک روز اُڑتی اُڑتی سنی کہ چھاپہ پڑا ہے اور پولیس "جاوید" کے خاص نمبر کے پرچے اٹھا کر لے گئی ہے۔ میں نے جان پہچان کے چند لوگوں سے پوچھا۔ کسی نے اس خبر کی تصدیق کی، کسی نے کہا: "ابی ہٹائیے، یہ جاوید والوں کا پبلسٹی اسٹنٹ ہے۔" اس دوران میں "جاوید" کے مالک نصیر انور کا رقعہ ملا۔

منٹو صاحب،

ایک خبر سنیے: آج پولیس نے دفتر "جاوید" پر چھاپہ مارا۔ تلاشی لینے پر بچے کھچے چند پرچے اپنے قبضے میں لے لیے۔ باقی پرچوں کی جانچ پڑتال ہوئی تو ڈپٹی رجسٹر نے واضح کر دیا کہ تمام پرچہ ہند و پاک کے مختلف اسٹیشنوں پر سپلائی ہو چکا ہے۔

رجسٹر میں سے تمام ایجنسیوں کے پتے نوٹ کر لیے گئے اور آیندہ سپلائی کا حساب کتاب بند کر دیا گیا۔ یہ کارروائی گرفتاری کا پیش خیمہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ جلد ہی ہم ملزموں کے کٹہرے میں ہوں گے ——— ایک اور بات قابلِ ذکر ہے کہ ایک مقامی ادارہ اس چھاپے کو اختراع اور پروپیگنڈے سے منسوب کرتا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ خیر اس کی تصدیق خود بخود

ہو جائے گی۔ مجھے تو یہ کہنا ہے کہ اب ذرا وہیں چلیے جہاں تین بار سزا پانے پر آپ بری قرار دیے گئے تھے۔ میرا خیال ہے کہ یہ بار آخر، بار ہو گی۔

خبر کی تصدیق ہو گئی۔ معاملہ پریس ایڈوائزری بورڈ کے سامنے پیش ہوا جس کے کنوینر کرنل فیض احمد فیض، ایڈیٹر "پاکستان ٹائمز" تھے۔ اس میں "جاوید" کے مالک نصیر انور بھی موجود تھے۔ ان کی زبانی اس میٹنگ کی مختصر روئداد سنیے:

"پاکستان ٹائمز" کے دفتر میں پریس ایڈوائزری بورڈ کی میٹنگ تھی۔ فیض احمد فیض کنوینر تھے۔ میٹنگ میں ایف۔ ڈبلیو۔ بسٹن (سول ملٹری گزٹ)، مولانا اختر علی (زمیندار)، حمید نظامی (نوائے وقت)، وقار انبالوی (سفینہ) اور امین الدین صحرائی (جدید نظام) شریک تھے۔ چودھری محمد حسین نے "جاوید" کا خاص نمبر پیش کیا۔ آپ نے سب سے پہلے پرچے کے باغیانہ اور اشتعال انگیز مضامین نظم و نثر گنوائے: "غلامی سے آزادی تک"، "رقصِ بسمل"، "سیلابِ چین" یہ تینوں نظمیں۔ مضامین میں سے "لورینگ سے فلیٹی تک"، "کھیڑا بہادر کی جے" اور "چین کتنی دور ہے" زیر بحث لائے گئے۔ فیض حکومت کے عائد کردہ الزام کی تردید کرتے رہے۔ دیگر اراکین نے ہاں میں ہاں ملائی اور یوں یہ سیاسی الزام ٹل گیا —— لیکن نزلہ "ٹھنڈا گوشت" پر گرا۔ فیض صاحب نے جب اسے غیر فحش قرار دیا تو مولانا اختر علی گرج اٹھے: "نہیں نہیں، اب ایسا ادب پاکستان میں نہیں چلے گا۔" جناب صحرائی نے اس پر صاد کیا۔ وقار صاحب نے افسانے کو ملعون و مطعون قرار دیا۔ حمید نظامی نے نوائے وقت کا ساتھ دیا اور جب ایف۔ ڈبلیو۔ بسٹن کو چودھری صاحب نے انگریزی میں "ٹھنڈا گوشت" سمجھایا تو مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ فرمانے لگے: "اس کہانی کی تعلیم یہ ہے کہ ہم مسلمان اتنے بے غیرت ہیں کہ سکھوں نے ہماری مردہ لڑکی تک نہیں چھوڑی . . ." مجھے ہنسی تو آگئی تھی لیکن جب چودھری صاحب غلط ترجمانی پر مصر رہے تو مجھے افسوس ہوا۔ میں نے لاکھ سمجھایا، فیض صاحب نے بھی ہر طرح سے اطمینان دلایا لیکن فیصلہ یہ ہوا کہ اب عدالت ہی اس کا فیصلہ کرے۔

چنانچہ چند دن بعد میں، نصیر انور اور عارف عبدالمتین گرفتار کر لیے گئے۔ گرفتار کرنے والے سب انسپکٹر چودھری خدا بخش تھے، بے حد شریف۔ کئی دن میرے مکان کے چکر کاٹتے رہے۔ ان دنوں میں اکثر باہر ہوتا۔ آخر ایک روز وہ مجھ سے ملنے میں کامیاب ہو گئے۔ بڑے اخلاق سے پیش آئے اور کہا: "کل صبح کسی دوست کے ساتھ تھانہ سول لائنز میں تشریف لے آیئے گا تاکہ آپ کی ضمانت ہو جائے" —— اس سے پہلے کئی مرتبہ مجھے پولیس کے آدمیوں سے پالا پڑ چکا تھا۔ چودھری خدا بخش صاحب کا نرم رویہ مجھ پر بہت اثر انداز ہوا۔

دوسرے روز صبح کو میں تھانے میں حاضر ہو گیا —— میرے دوست شیخ سلیم نے دستخط کیے اور ہم مقدمے کے پہلے مرحلے سے فارغ ہو گئے۔

عارف عبدالمتین بہت ہی پریشان تھے۔ ان کا حلق خشک ہوا جاتا تھا۔ یہ حیرت کی بات ہے کیونکہ وہ کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم کارکن ہیں۔ عدالت سے خدا معلوم کیوں اتنے خائف تھے۔ بہرحال سمن جاری ہوئے۔ سماعت کی تاریخ مقرر ہوئی اور ہم تینوں ضلع میں حاضر ہوئے۔

میرے لیے یہ جگہ کوئی نئی جگہ نہیں تھی۔ اپنے پچھلے تین مقدموں کے سلسلے میں مَیں یہاں کئی مرتبہ آچکا تھا اور دھول پھانک چکا تھا ——— نام تو ضلع کچہری ہے لیکن بے حد غلیظ جگہ ہے: مچھر، مکھیاں، کیڑے مکوڑے ——— ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کی جھنکاریں ——— نہایت ہی دقیانوس ٹائپ رائٹروں کی اکتا دینے والی ٹپ ٹپ ——— تین ٹانگوں والی کرسیاں جن کی نشست کا بید ہی غائب ہے ——— دیواروں پر سے پلستر اکھڑ رہا ہے ——— باغ ہے جس کا لان افلاس زدہ میلے کچیلے کشمیری کے سر کی طرح گنجا ہے ——— برقع پوش عورتیں ننگے گرد سے اَٹے ہوئے فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھی ہیں ——— کوئی گندی گالیاں بک رہا ہے، کوئی بسور رہا ہے ——— اندر کمروں میں مجسٹریٹ صاحبان نہایت ہی واہیات میزوں کے پاس بیٹھے مقدموں کی سماعت فرما رہے ہیں، پاس دوست یار بیٹھے ہیں۔ دورانِ سماعت ان سے بھی گفتگو جاری ہے . . . .

الفاظ ضلع کچہری کی صحیح تصویر نہیں کھینچ سکتے ——— یہاں کی فضا الگ، یہاں کا ماحول الگ، یہاں کی زبان الگ، یہاں کی اصطلاحات الگ ——— عجیب و غریب جگہ ہے یہ، خدا اس سے دُور ہی رکھے . . .

آپ کو نقل لینی ہو تو درخواست کے ساتھ "پہیے" لگانے پڑیں گے۔ کوئی مثل معائنے کے لیے نکلوانی ہو تو بھی "پہیے" لگانے پڑیں گے۔ کسی افسر سے ملنا ہو تو بھی "پہیے" لگانے پڑیں گے۔ اگر کام فوری کرانا ہے تو پہیوں کی تعداد بڑھ جائے گی ——— غور سے دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ اگر آپ کی آنکھیں صرف دیکھ سکتی ہیں تو آپ کو ضلع کچہری میں ہر عرضی پہیوں پر چلتی نظر آئے گی۔ ایک دفتر سے دوسرے دفتر تک چار پہیے۔ دوسرے دفتر سے تیسرے دفتر تک جانے کے لیے آٹھ پہیے وقس علیٰ ہذا ——— اگر آپ عادی مجرم نہیں تو آپ کے دل میں زبردست خواہش پیدا ہوگی کہ کوئی آپ کے پہیے لگا دے اور دھکا دے دے تاکہ آپ ضلع کچہری سے باہر نکل جائیں۔

وکیل کا سوال درپیش تھا۔ عدالت میں حاضر ہونے سے پہلے جناب تصدق حسین خالد سے ملاقات ہوئی۔ آپ نے کمالِ مہربانی سے خود ہی کہا کہ وہ ہمارے مقدمے کی پیروی کرنے میں مسرت محسوس کریں گے۔ چنانچہ ان کو ہی تکلیف دی گئی۔

خالد صاحب آئے۔ ہم ملزمین میاں اے۔ ایم۔ سعید، پی۔ سی۔ ایس، مجسٹریٹ درجہ اوّل کی عدالت میں پیش ہوئے۔ میاں صاحب موصوف کسی زمانے میں کپتانی کے عہدے پر فائز تھے مگر اب ان سے بندوق لے کر عدل و انصاف کی ترازو ان کے ہاتھ میں دے دی گئی تھی: چھوٹی چھوٹی تیز آنکھیں، چھریرا بدن، رنگ سانولا ——— کرسی پر بڑی تمکنت سے بیٹھے تھے۔ ہم ملزمین سلام کرکے کٹہرے میں کھڑے

ہوئے تو آپ ہماری طرف دیکھے بغیر میاں تصدق حسین خالد کی طرف متوجہ ہوئے۔ ایک بار پھر ضمانتیں ہوئیں۔ اس کے بعد دوسری سماعت کی تاریخ مل گئی۔ ہم نے میاں سعید صاحب کو سلام کیا اور عدالت سے باہر نکل آئے۔

جون کا مہینہ تھا۔ سب کے حلق خشک تھے مگر عارف عبدالمتین کا حلق تو بالکل لکڑی ہو رہا تھا ——— کاش وہاں کوئی پارٹی ممبر ہوتا۔

ہم دو تین پیشیاں اسی طرح بھگتے ——— موسم ظالمانہ حد تک گرم ہو چکا تھا لیکن قہر درویش بر جانِ درویش "آواز پڑنے تک" عدالت کے باہر کھڑے رہتے ——— کیونکہ ڈر لگا رہتا کہ اگر ہم ادھر ادھر ہو گئے تو مجسٹریٹ صاحب کا قہر نازل ہو جائے گا ——— شروع ہی سے ان کا رویہ بہت سخت تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ پہلے ہی سے اپنے دل میں ہمارے خلاف فیصلہ مرتب کر چکے ہیں۔

میاں خالد نے مجھ سے کہا: "کیوں نہ ہم اس عدالت سے اپنا مقدمہ منتقل کرا لیں۔ مجسٹریٹ کا رویہ صاف مخاصمانہ ہے . . . "

میں نے کہا: "میاں صاحب، چھوڑیئے۔ دوسری عدالت میں مقدمہ لے گئے تو کیا ہمیں وہاں لڈو پیڑے کھلائے جائیں گے . . . رہنے دیجیے مقدمے کو یہیں۔"

میاں خالد مان گئے۔ چنانچہ ہم دو تین پیشیاں بھگتے ——— استغاثے کی طرف سے مسٹر محمد یعقوب ولد میاں غلام قادر منیجر کپور آرٹ پریس لاہور، شیخ محمد طفیل حلیم اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ ڈی سی آفس لاہور، سید ضیاء الدین احمد مترجم پریس برانچ پنجاب گورنمنٹ اور چند اور حضرات رسمی طور پر پیش کیے گئے۔

سید ضیاء الدین نے کہا کہ میری رائے میں "ٹھنڈا گوشت" تمام کا تمام فحش ہے۔

میاں خالد کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ جہاں تک مصنف کی کوشش کا تعلق ہے، وہ نیک ہے مگر اندازِ اظہار اور استعمالِ الفاظ غلط ہے۔

میاں خالد نے گواہ سے ایک اور سوال کیا: "کیا مصنف کو اپنے کردار کے منہ میں ایسے الفاظ نہیں ڈالنے چاہئیں جو اس کی صحیح شخصیت پیش کریں؟"

سید صاحب نے جواب دیا: "جس قسم کا کردار ہو، ویسے ہی الفاظ استعمال کرنے چاہئیں۔"

——— آپ نے یہ بھی تسلیم کیا کہ مصنف کا یہ کام ہے کہ وہ اچھے بُرے کردار تخلیق کرے۔

شہادت استغاثہ ختم ہوئی۔ مجسٹریٹ صاحب نے حسبِ ضابطہ رسمی طور پر ہم سے چند سوال کیے جن کا مختصر جواب دے دیا گیا۔ یہ سلسلہ عدالتی زبان میں "استفسار ملزم بلا حلف" کہلاتا ہے اور کچھ اس قسم کا ہوتا ہے۔

سوالِ عدالت: آپ پر الزام ہے کہ آپ نے بحیثیت مصنف مضمون "ٹھنڈا گوشت" جو کہ رسالہ "جاوید" کے خاص نمبر میں بغرضِ اشاعت نصیر انور پرنٹر و پبلشر ملزم ہمراہی اور عارف عبدالمتین اور نصیر انور ایڈیٹر رسالہ مذکور کو دیا کہ فحش تھا دیا۔ یہ جرم زیر دفعہ ۲۹۲ تعزیراتِ ہند کی تعریف میں آتا ہے۔ کیوں نہ آپ کو اس جرم کی سزا دی جائے؟

جواب : (جو خالد صاحب نے میری طرف سے دیا) میں نے افسانہ "ٹھنڈا گوشت" "جاوید" میں بغرضِ اشاعت دیا لیکن وہ فحش نہیں تھا اور نہ میں اسے فحش تصور کرتا ہوں۔ یہ افسانہ اصلاحی ہے۔
سوالِ عدالت : مقدمہ کیوں بنایا گیا؟
جواب : پولیس بہتر جانتی ہے۔ اس کا نقطۂ اخلاق و اصلاح ہم سے مختلف ہے۔
سوالِ عدالت : کچھ اور کہنا چاہتے ہیں؟
جواب : اس موقعہ پر نہیں۔

اب ہم سے صفائی کے گواہوں کی فہرست پیش کرنے کے لیے کہا گیا۔ یہ فہرست ہم نے پہلے ہی سے تیار کر رکھی تھی۔ چنانچہ فوراً پیش کر دی گئی۔ میاں سعید صاحب نے جب تنتیس نام دیکھے تو خفا ہو گئے۔ کہا : "میں اتنا ہجوم نہیں بلا سکتا . . . "

میاں خالد نے اصرار کیا کہ ہر گواہ اپنی جگہ پر بہت اہم ہے۔

میاں سعید نے اپنے انداز میں مضحکہ اڑانے کی کوشش کی ! ممتاز شیریں صاحبہ کا نام پڑھا تو ارشاد کیا : "یہ ممتاز شانتی کون ہے . . . " عدالت کے آدمی میاں صاحب کے اس مذاق پر ہنسے —— ہم ہونٹ بھینچے خاموش رہے۔

بڑی مشکلوں کے بعد مجسٹریٹ صاحب، درجہ اوّل چودہ گواہ بلانے پر راضی ہوئے۔

چنانچہ فہرست پر نشان لگا دیے گئے۔

سمن جاری ہوئے —— میں کسی گواہ سے نہ ملا کیونکہ میں چاہتا تھا کہ ہر ایک میرے افسانے کے متعلق اپنی بے لاگ رائے دے تاکہ مجھے اپنی صحیح پوزیشن معلوم ہو سکے۔

جن گواہوں کے سمن کی تعمیل ہو چکی تھی، ان کو صبح سویرے عدالت میں حاضر ہونا پڑتا تھا —— میں بے حد شرمندہ تھا کیونکہ غریب کام کاج چھوڑ کر کئی کئی گھنٹے کھڑے رہتے تھے۔ ہم تو ملزم تھے لیکن ان کی حالت بھی ہم جیسی تھی۔ ہم اندر کٹہرے میں کھڑے رہتے تھے اور وہ عدالت کے باہر لوہے کے جنگلے کے ساتھ لگے انتظار کرتے رہتے تھے کہ انھیں کب آواز پڑتی ہے۔

میرے دوست شیخ سلیم کی حالت قابلِ رحم تھی۔ صبح شام پینے کا عادی، سارا وقت جمائیاں لیتا رہتا تھا۔ آخر اس سے یہ اذیت برداشت نہ کی گئی —— وہ چھوٹی سی بوتل میں وسکی بھر کے لے آتا اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد پیتا رہتا۔ ادب سے اس کو دُور کا بھی واسطہ نہیں لیکن جب وہ دوسروں سے باتیں کرتا تو یہی کہتا : "آخر فحاشی ہے کیا؟ منٹو کا افسانہ "ٹھنڈا گوشت" میں نے پڑھا نہیں لیکن یہ فحش نہیں ہو سکتا . . . منٹو آرٹسٹ ہے۔"

ہماری طرف سے پہلے گواہ سید عابد علی عابد، ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی، پرنسپل دیال سنگھ کالج، لاہور تھے۔ آپ نے بیان دیتے ہوئے کہا : "میں نے رسالہ 'جاوید' میں 'ٹھنڈا گوشت' پڑھا ہے۔ یہ ایک ادب پارہ ہے . . . منٹو صاحب کی میں نے تمام تصانیف پڑھی ہیں۔ پریم چند کے بعد جو مختصر افسانہ نگار مشہور ہوئے ہیں ان میں سعادت حسن منٹو کو ایک خاص مقام حاصل ہے . . . اس افسانے سے ایشر سنگھ کے کردار

کا نمایاں ترین اثر یہ ہے کہ اس نے جو ناروا حرکت کی، اس کی سزا اسے فطرت کی طرف سے نفسیاتی نامردی کی صورت میں مل گئی . . . "

عدالت کے ایک سوال پر عابد صاحب نے کہا: ولی سے لے کر غالب تک سب، وہ چیز جسے فحش کہا جاتا ہے، لکھتے چلے آئے ہیں۔ وہ لٹریچر کبھی فحش نہیں ہوتا جو ایک بار لٹریچر قرار دیا جا چکا ہو . . . "

استغاثے کی طرف سے سوال کیا گیا: "ادب مقصود بالذات ہے؟"

عابد صاحب نے جواب دیا: " میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ادب تنقیدِ حیات ہے اور اس میں اس سوال کا جواب شامل ہے۔ ہر معقول انسان کے قول و فعل کا مطلب ہوتا ہے لیکن تمام انسان معقول نہیں ہوتے۔ ہر قول یا فعل سوسائٹی کی نظروں میں اچھا یا برا ہو سکتا ہے۔ اچھے اور برے فعل جانچنے کے لیے بے شمار معیار ہوتے ہیں . . . "

استغاثے کے ایک اور سوال کے جواب میں عابد صاحب نے کہا: "یہ افسانہ میرے سب بچوں اور بچیوں نے پڑھا ہے . . . میری ایک لڑکی جو فورتھ ایئر میں پڑھتی ہے، اس سے کئی بار سیکس پر علمی بحث ہو چکی ہے جو اس کے نصاب کا جزو ہے . . . پھر آپ نے کہا: "خاص آدمیوں سے جو کہ ادیب ہیں، اس افسانے کے بارے میں میرا تبادلۂ خیالات ہوا ہے، سب نے اس کو بہت سراہا ہے . . . "

صفائی کے دوسرے گواہ مسٹر احمد سعید، پروفیسر نفسیات، دیال سنگھ کالج، لاہور تھے۔ آپ نے اپنے بیان میں کہا کہ افسانہ "ٹھنڈا گوشت" فحش نہیں ہے۔ اس میں ایک بہت بڑا جنسی مسئلہ ہے —— ان کے نزدیک فحش لفظ کی کوئی بنیاد ہی نہیں —— دوسرے الفاظ میں فحاشی ایک اضافی چیز ہے۔ ذہنی طور پر بیمار اشخاص پر "ٹھنڈا گوشت" پڑھنے سے برا اثر ہو سکتا ہے۔

تیسرے گواہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی، پی۔ ایچ۔ ڈی، سابق ڈائرکٹر آف ایجوکیشن کشمیر تھے۔ آپ نے اپنے بیان میں کہا: " انسانی نفسیات کے اندر جو خیر و شر ہے، ادیب کا یہ کام ہے وہ اس کو اس انداز سے پیش کرے کہ جس سے انسانی زندگی کے حقایق سمجھنے میں مدد مل سکے . . . برے کردار کو اس انداز سے پیش کرے کہ اس کی برائی دیکھ کر نفرت پیدا ہو . . . "

خلیفہ صاحب نے اپنے بیان میں یہ بھی کہا: "زیر بحث افسانے کے کردار ایشر سنگھ سے شدید کراہت اور نفرت پیدا ہوتی ہے۔ یہ کردار بالکل صحیح ہے۔ ایسے کرداروں پر خاص کیفیتوں کے ماتحت جسمانی حالت درست ہونے کے باوجود نفسیاتی نامردی طاری ہو سکتی ہے . . . "

ان تین گواہوں کے بیان ایک پیشی میں ہوئے۔ چونکہ یہ خاصے طویل تھے اور ایک ایک لفظ خود مجسٹریٹ صاحب کو لکھنا پڑتا تھا اس لیے وہ جھنجھلا جھنجھلا جاتے تھے۔ کئی بار آپ نے تنگ آ کر کہا: " میں مجسٹریٹ ہوں یا محرر . . . " لیکن بہر حال انھیں اپنا فرض ادا کرنا ہی پڑتا تھا۔

اس پیشی میں ایک بڑی دلچسپ بات ہوئی۔ میرے ہاتھوں میں سگرٹوں کا ڈبہ تھا۔ غالباً کریون اے کا۔ مجسٹریٹ صاحب کی نظر پڑی تو آپ نے مجھے ایک بہت بڑی ڈانٹ پلائی: "یہ گھر نہیں ہے، عدالت ہے . . . "

میں نے مؤدبانہ عرض کیا: "لیکن حضور میں پی تو نہیں رہا ہوں . . . "

آپ نے اور زیادہ گرم ہو کر کہا: " خاموش رہو۔ ڈبہ اپنی جیب میں رکھو . . . "

میں نے حکم کی تعمیل کی ——— مجسٹریٹ صاحب، درجہ اوّل نے میز پر سے اپنا سگریٹ ٹن اٹھایا اور ایک سگریٹ سلگا کر پینا شروع کر دیا اور میں ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا اس کا بکھرا ہوا دھواں پیتا رہا۔
اگلی پیشی پر میاں تصدق حسین خالد تشریف نہ لائے کیونکہ ان کے گھر میں کوئی علیل تھا۔ ہمیں تاریخ مل گئی۔
اس تاریخ پر میاں صاحب موصوف پھر تشریف نہ لائے کہ ان کا لڑکا ولایت سے واپس آرہا تھا اور وہ اس کے استقبال کے لیے کراچی چلے گئے تھے۔ ہم سخت الجھن میں گرفتار ہو گئے۔ میں نے مجسٹریٹ صاحب سے مؤدبانہ گزارش کی کہ ہمیں تاریخ دے دی جائے، اس لیے کہ ہمارا وکیل موجود نہیں ہے ——— آپ نے اس سے انکار کر دیا اور حکم دیا کہ کارروائی شروع ہو۔
میں بہت ٹپٹایا۔ گواہ کو آواز دی گئی۔ ڈاکٹر سعید اللہ ایم اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی، ڈی ایس سی (ان دنوں پاکستان ایئر فورس کے سولین آفیسر) تشریف لائے۔ اب میں سوچنے لگا کہ کیا کروں، مگر شاید اس لیے کہ خاندان کے سب بزرگ وکیل اور باپ سب جج تھے، دو بڑے بھائی بیرسٹر، اس لحاظ سے خون میں کسی قدر قانون گھلا ہوا تھا، میں نے میاں تصدق حسین صاحب خالد کی جگہ سنبھال لی اور اپنے گواہ نمبر ۲ ڈاکٹر سعید اللہ صاحب سے بیان دلوانا شروع کر دیا۔ بات بات پر مجسٹریٹ صاحب مجھے ٹوکتے: "تم اس طرح سوال نہیں کر سکتے . . تم یہ بات نہیں پوچھ سکتے . . ." میں ڈٹا رہا۔
ڈاکٹر صاحب کا بیان آدھا ختم ہوا تھا کہ عدالت کے کمرے میں چار نوجوان وکیل، کالے کوٹ پہنے بڑے چست، بڑے بانکے داخل ہوئے اور ڈاکٹر سعید اللہ صاحب کے پاس کھڑے ہو گئے۔ ایک جس کی پتلی پتلی مونچھیں تھیں اور جس کا رنگ باقی دو کے مقابلے میں کسی قدر سانولا تھا، میرے ساتھ کٹہرے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب مجھے سانس لینے کا موقعہ ملا تو اس نے میرے کان میں کہا: "منٹو صاحب، کیا ہم آپ کے مقدمے کی پیروی کر سکتے ہیں؟"
میں نے کچھ نہ سوچا اور کہا: "جی ہاں، آپ مقدمے کی پیروی کر سکتے ہیں . . ." چنانچہ پتلی پتلی مونچھوں والے اس نوجوان نے پیروی شروع کر دی۔
مجسٹریٹ صاحب نے اس سے پوچھا: "آپ کون؟"
وکیل نے مسکرا کر جواب دیا: "حضور، میں ان کا وکیل ہوں۔ کیوں منٹو صاحب؟"
میں نے اثبات میں سر ہلا دیا ——— کارروائی شروع ہوئی۔ اس وکیل کے باقی تین ساتھی بھی حصہ لینے لگے۔ ان کی سرگرمی میں بڑا دلکش رنگین تھا، وہ جو کالج کے زندہ دل طلبا میں ہوتا ہے۔
مجسٹریٹ بھنا گئے۔ آپ نے ان تین سے پوچھا: "آپ حضرات کیوں بیچ میں بول رہے ہیں . . ."
انھوں نے جواب دیا: "حضور ہم ملزموں کے وکیل ہیں۔ کیوں منٹو صاحب؟"
میں نے پہلے کی طرح اثبات میں سر ہلا دیا۔
ڈاکٹر سعید اللہ صاحب نے اپنے بیان میں جو کچھ کہا میں اسے مختصراً پیش کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا:
"ٹھنڈا گوشت" پڑھنے کے بعد میں خود ٹھنڈا گوشت بن گیا۔ پژمردگی اور افسردگی، یہ تھا اس کا اثر۔ یہ افسانہ شہوانی ہیجان ہرگز پیدا نہیں کرتا . . . ایشر سنگھ کا کردار پیش کرنے کے لیے مصنف نے دو تین دفعہ گالی استعمال کی ہے۔ شاید فن کار نے اسے مناسب سمجھا ہو مگر گالی کی شکل اس نے اس طرح بدل دی ہے کہ گالی معلوم نہیں ہوتی . . . اگر وہ گالی جو ایشر سنگھ نے استعمال کی ہے، گالی بھی رہتی، تب بھی میرے

نزدیک افسانہ فحش نہ ہوتا۔ گالی فحش بھی ہوسکتی ہے اور فحش نہیں بھی ہوسکتی۔ . . . اگر فن کار صحیح فن کار ہے تو وہ گالی کو بغیر ضرورت کبھی استعمال نہیں کرتا۔ اس افسانے میں گالی کا استعمال فن کارانہ ہے۔ . . .

پروسی کیوٹر صاحب بڑے نستعلیق قسم کے آدمی تھے، بہت بانکے، کج کلاہ، گردن میں ہلکا سا شاندار خم، آنکھوں پر رم لیس چشمہ جسے وہ بار بار اپنی ناک سے اتارتے اور جماتے رہتے تھے۔ آپ نے ازراہِ تمسخر کچھ کہا تو ڈاکٹر سعید اللہ صاحب برس پڑے، اس زور سے کہ دوسرے کمرے میں صوفی تبسم صاحب کرسی پر سے اچھل کر باہر نکل آئے۔ بہر حال معاملہ ٹل گیا۔

پروسی کیوٹر صاحب نے جن کا نام غالباً محمد اقبال تھا، ڈاکٹر صاحب سے پوچھا: "نفسِ مضمون کے لحاظ سے مختلف ادبا کو مختلف القاب دیے گئے ہیں، مثلاً راشد الخیری کو مصورِ غم، اقبال کو مصورِ حقیقت اور خواجہ حسن نظامی کو مصورِ فطرت کہا گیا ہے، آپ . . ."

ڈاکٹر صاحب نے اقبال صاحب کی بات کاٹ کر کہا: "میں 'ٹھنڈا گوشت' کے مصنف کو مصورِ حیات کا لقب دوں گا . . ."

اب کرنل فیض احمد فیض، ایڈیٹر "پاکستان ٹائمز" کی باری آئی۔ آپ نے اپنے بیان میں کہا: "میری رائے میں افسانہ فحش نہیں ہے۔ ایک افسانے کے الگ الگ الفاظ کو فحش یا غیر فحش کہنے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ افسانے پر تنقید کرتے وقت مجموعی طور پر تمام افسانہ زیر نظر ہوگا اور ہونا چاہیے۔ محض عریانی کسی چیز کے فحش ہونے کی دلیل نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس افسانے کے مصنف نے فحش نگاری تو نہیں کی ہے لیکن ادب کے اعلیٰ تقاضوں کو بھی پورا نہیں کیا ہے کیونکہ اس میں زندگی کے بنیادی مسائل کا تسلی بخش تجزیہ نہیں ہے۔ . . ."

جرح کے جواب میں فیض صاحب نے کہا: "'میری بھپیاں لے رہے تھے'، اگر موضوع تقاضا کرے تو میں ایسے الفاظ کا استعمال جائز سمجھتا ہوں۔ 'منہ بھر بھر کے بوسے لیے'، 'چوس چوس کر اس کا سارا سینہ تھوکوں سے لتھیڑ دیا' یہ الفاظ پارلیمنٹری نہیں لیکن ادبی اعتبار سے جائز ہیں۔ . . ."

فیض صاحب کے بعد صوفی غلام مصطفےٰ صاحب تبسم، پروفیسر گورنمنٹ کالج، لاہور تشریف لائے۔ آپ نے اپنے بیان میں کہا: "افسانہ 'ٹھنڈا گوشت'، لوگوں کے اخلاق کو خراب نہیں کرتا۔ ہوسکتا ہے اس کے بعض فقرے الگ سے فحش ہوں۔ . . . آج انسانی جنسیات کو ادب کا موضوع بنا کر ہمارے لٹریچر کا رجحان ایک صحیح سمت کی طرف جا رہا ہے۔"

جرح کا جواب دیتے ہوئے صوفی صاحب نے فرمایا: "کوئی افسانہ یا ادب پارہ فحش نہیں ہوسکتا جب تک لکھنے والے کا مقصد ادب نگاری ہے۔ ادب بحیثیت ادب کے کبھی فحش نہیں ہوتا۔"

اقبال صاحب نے اپنی ناک پر سے کئی مرتبہ جلدی جلدی رم لیس چشمہ اتارا اور جمایا۔ وہ صوفی صاحب کو گھیر گھار کر اپنے مطلب کی بات کہلوانا چاہتے تھے مگر صوفی صاحب طفلِ مکتب نہیں تھے۔ وہ بیس برس سے استادی کرتے چلے آئے تھے، اقبال صاحب کے جال میں نہ پھنسے۔ ایک مرتبہ تو آپ نے صاف کہہ دیا: "دیکھیے صاحب، آپ لاکھ الٹ پھیر کریں لیکن میں وہی کچھ کہوں گا جو مجھے کہنا ہے۔ . . ."

اقبال صاحب نے سوال کیا: "اگر کسی تحریر، افسانے یا ادب پارے کے نتائج مخرب الاخلاق ہوں اور مصنف کا مقصد تخریبِ اخلاق نہ ہو تو آپ اس افسانے کو فحش کہیں گے یا نہیں؟"

صاف ظاہر تھا کہ اقبال صاحب کیا چاہتے ہیں۔ صوفی صاحب نے مسکرا کر جواب دیا: "نہیں، اس لیے کہ پڑھنے والوں کے اپنے ذہنی رجحانات بھی شامل ہوں گے، نہ کہ مصنف کا مطلب۔ ۔ ۔ تخلیقِ ادب مصنف اپنی طبع سے مجبور ہو کر کرتا ہے، اور یہ تخلیق اوروں کے لیے بھی ہوتی ہے۔ ۔ ۔"

اقبال صاحب نے ایک اور سوال کیا: "اگر اس تصنیف سے لوگوں کے اخلاق پر بُرا اثر پڑے تو اس کی ذمہ داری ادیب پر ہوگی یا نہیں؟"

صوفی صاحب نے کھٹ سے جواب دیا: "وہ بری الذمہ ہے۔"

اقبال صاحب نے عاجز آ کر پوچھا: "آخر مخربِ اخلاق تحریر کیا ہے؟"

صوفی صاحب نے جواب دیا: "وہ تحریر جس سے لکھنے والے کا مقصد محض تخریبِ اخلاق ہو۔ ۔ ۔"

اقبال صاحب نے ناک پر اپنا رِم لیس چشمہ جمادیا اور گردن کو ذرا خمیدہ کر کے جرح بند کر دی۔

ڈاکٹر آئی۔ لطیف، ہیڈ آف دی سائیکولوجی ڈیپارٹمنٹ، ایف۔ سی۔ کالج، لاہور بلائے گئے ——

میں نے ان کا نام سُنا تھا لیکن انھیں دیکھا کبھی نہیں تھا۔ آپ صوفی صاحب کے بیان کے دوران میں میاں سعید صاحب کے پاس بیٹھے تھے اور رسالہ "جاوید" کا خاص نمبر ان کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے ان کی طرف غور ہی نہیں کیا تھا۔ جب وہ بیان دینے لگے تو میں نے انھیں غور سے دیکھا۔ کالا رنگ۔ سب سے پہلے مجھے ان کی تیکھی مونچھیں نظر آئیں۔

آپ نے رسالہ ایک طرف رکھا اور کہنا شروع کیا: "میں نے 'ٹھنڈا گوشت' ابھی ابھی پڑھا ہے۔ یہ ایک غلط رسالے میں چھپا ہے۔ میرا مطلب ہے، یہ افسانہ ایک پاپولر رسالے میں نہیں چھپنا چاہیے تھا۔ اگر کسی سائنٹفک رسالے میں کیس ہسٹری کے طور پر، مردی اور نامردی کی تائید یا تردید میں چھپتا تو اس پر فحاشی کا الزام عائد نہیں ہو سکتا تھا۔ ۔ ۔ جن الفاظ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، بولنے میں مَیں ان کو بُرا سمجھتا ہوں لیکن کیس ہسٹری میں یہ الفاظ بڑی اہمیت رکھیں گے۔"

خدا معلوم کیا بات ہوئی کہ ڈاکٹر لطیف نے ایک دم پوچھا: "مسٹر منٹو کون ہیں۔ ۔ ۔؟"

میں نے کہا: "جناب، یہ خاکسار ہے۔"

ڈاکٹر صاحب کی تیکھی مونچھیں تھرتھرائیں۔ آپ نے مجھ سے کچھ نہ کہا اور بیان دینے میں مشغول ہو گئے۔

وکیل صاحب نے میرے کان میں کہا: "منٹو صاحب، آپ کا یہ گواہ تو ہوسٹائل ہو گیا ہے۔ اب آپ اس پر جرح کر سکتے ہیں۔"

میں نے کہا: "ہٹائیے۔ ۔ ۔"

لیکن وکیل صاحب نے جرح کر ہی دی۔ اس کے جواب میں ڈاکٹر لطیف صاحب نے کہا: "افسانہ ایسے رسالے میں جس کو ہر بچہ بوڑھا، لڑکا لڑکی پڑھ سکے، نہیں چھپنا چاہیے تھا کیونکہ ایسی طبائع جو جذبات کو مشتعل کرنے والے تاثرات قبول کرنے والی ہوں، یہ افسانہ پڑھ کر مشتعل ہوں گی۔ ۔ ۔"

جرح ختم ہوئی تو ڈاکٹر لطیف صاحب میرے پاس آئے۔ انھوں نے ہاتھ ملایا اور کہا: "آپ نے مجھے گواہی کے لیے بلایا تھا تو کم از کم مل تو لیے ہوتے۔"

میں نے مسکرا کر جواب دیا: "انشاء اللہ اب ملاقات کا شرف حاصل کروں گا۔ ۔ ۔"

ڈاکٹر صاحب نے پھر ہاتھ ملایا اور چلے گئے۔

اب میں ان چار نوجوان وکیلوں کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں جو بڑے ڈرامائی انداز میں میرے مقدمے میں داخل ہوئے تھے۔ پتلی پتلی مونچھوں، تیکھی ناک اور سانولے رنگ والے شیخ خورشید احمد تھے۔ کافی ہاؤس ان کے بغیر نامکمل ہے۔ دوسرے تین تھے: مسٹر مظہر الحق، مسٹر سردار محمد اقبال اور مسٹر اعجاز محمد خاں۔ آپ لوگوں کو بار روم میں معلوم ہوا کہ میں خود اپنا کیس کنڈکٹ کر رہا ہوں اور پریشان ہوں تو وہ میری مدد کے لیے چلے آئے —— میں نے ان کا شکریہ مناسب و موزوں الفاظ میں ادا کیا۔

شیخ خورشید احمد نے کہا: "اس کی کوئی ضرورت نہیں . . . لیکن داد دیجیے کہ میں نے آپ کا افسانہ 'ٹھنڈا گوشت' پڑھا کیا، دیکھا تک نہیں ہے . . ." ہم سب خوب ہنسے۔ شیخ نے کہا: "اور میں شرط لگانے کے لیے تیار ہوں کہ مسٹر اقبال نے بھی یہ افسانہ ابھی تک نہیں پڑھا ہے . . ."

ہماری طرف سے سات گواہ اب تک پیش ہوئے تھے۔ بقایا گواہوں کو بلوانے کے لیے جب شیخ خورشید صاحب نے عدالت سے درخواست کی تو مسترد کر دی گئی۔ مجسٹریٹ صاحب نے اس خیال سے کہ ہمارا پلڑا وزنی ہے، عدالت کی طرف سے چار گواہ طلب کیے: مولانا تاجور نجیب آبادی، شورش کاشمیری، ابو سعید بزمی اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر۔

ہم نے کئی تاریخیں بھگتیں مگر یہ حضرات جمع نہ ہوئے۔ آخر ایک تاریخ پر سب آ گئے۔ تاجور صاحب سے علیک سلیک ہوئی تو آپ نے لکچر پلانا شروع کر دیا کہ میں ایسے غلیظ، فحش اور واہیات افسانے لکھتا کیوں ہوں —— میں خاموش سنتا رہا۔ اس لیے کہ مولانا کے ساتھ بحث کرنا فضول تھا۔

آغا شورش بڑے پُرشور طریقے پر ملے۔ ابو سعید بزمی نے مجھ سے ایک سگریٹ لیا اور سلگا کر ٹہلنے لگے —— آواز پڑی تو ہم حاضرِ عدالت ہوئے۔ کارروائی شروع ہوئی۔ پہلے گواہ منجانب عدالت شمس العلما مولانا احسان اللہ خاں تاجور نجیب آبادی، پروفیسر دیال سنگھ کالج، لاہور تھے۔ آپ نے فرمایا: "ٹھنڈا گوشت، کسی مسجد میں یا کسی مجلس میں جماعتی حیثیت میں سننا پسند نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی پڑھے تو اپنا سر سلامت لے کر نہ جا سکے۔ چالیس سالہ ادبی زندگی میں ایسا ذلیل اور گندہ مضمون میری نظر سے نہیں گزرا ہے . . ."

میں نے مولانا سے چند سوال کیے تو آپ نے جواباً کہا: "یہ افسانہ میں نے پہلی بار دیال سنگھ کالج میں پڑھا لیکن پورا نہیں پڑھا۔ تھوڑا سا پڑھا اور لغو سمجھ کر بند کر دیا . . . مثنوی گلزارِ نسیم میں بکاؤلی اور تاج الملوک کی شادی کا تذکرہ اخلاق سے متصادم ہے . . . فسانۂ عجائب، مثنوی بہارِ عشق، مثنوی فریبِ عشق اور الف لیلیٰ میں جو فحش حصے ہیں، وہ فحش ہیں۔ حکایتِ خانم و کنیز کا ذکر مثنوی مولانا روم میں آتا ہے لیکن میں نے نہیں پڑھا . . . جنسی ترغیب کا پہلو مثنوی مولانا روم میں نہیں ہو سکتا . . ."

جی چاہتا تھا کہ مولانا کو خوب ستاؤں مگر میں نے مناسب خیال نہ کیا اور چند سوال اور کر کے ان کو چھوڑ دیا —— اب آغا شورش کاشمیری ولد آغا نظام الدین، ایڈیٹر ہفتہ وار "چٹان" مونچھوں کے اندر مسکراہٹیں بکھیرتے تشریف لائے۔ میری طرف دیکھ کر آپ کھل کے مسکرائے اور بیان دینا شروع کر دیا۔

آپ نے فرمایا: "جہاں تک میرے علم اور احساسات کا تعلق ہے، میں نے 'ٹھنڈا گوشت' سے اچھے تاثرات فراہم نہیں کیے۔ میں جس سماج اور گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں، اس کے پیشِ نظر میں ایسا مضمون

اپنے پرچے میں شایع نہیں کروں گا۔ میرا مذاقِ فکر اسے گوارا نہیں کرتا۔"

استغاثے کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے آغا صاحب نے کہا: "اس سے اوباش قاری کو ترغیب ہوتی ہے، ان لوگوں کو جن کا رجحانِ طبیعت خاص طور پر بدکاری کی طرف مائل ہو۔ . . ."

ہماری طرف سے آغا صاحب پر کوئی جرح نہ کی گئی ——— ابو سعید بزمی، ایڈیٹر "احسان" لاہور پیش ہوئے تو آپ نے افسانے کو مخربِ اخلاق قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ: "افسانہ معنی و مطلب کی وجہ سے قابلِ اعتراض ہے۔ . . ."

میں نے بزمی سے پوچھا: "کیوں حضرت، یہ بتائیے، کیا اسی عدالت میں آپ کے خلاف ازالۂ حیثیتِ عرفی کا مقدمہ چل رہا ہے۔ . . ."

آپ نے جب "جی ہاں" کہا تو مجسٹریٹ صاحب نے حیرت سے پوچھا: "میری عدالت میں؟"

بزمی صاحب نے پھر جواب دیا: "جی ہاں۔"

مجسٹریٹ صاحب نے قلم سے سر کھجا کر پائپ سلگایا اور اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔

آخری گواہ منجانبِ عدالت پیش ہوئے یعنی ڈاکٹر تاثیر صاحب، پرنسپل اسلامیہ کالج، لاہور۔ آپ نے اپنے بیان میں کہا: "کہانی ادبی لحاظ سے ناقص ہے لیکن بے ادبی۔ نشان لگائے ہوئے الفاظ کچھ اس کہانی کے لیے ضروری ہیں کچھ غیر ضروری۔ کچھ الفاظ ایسے ہیں جن کو ناشائستہ کہا جا سکتا ہے لیکن میں فحش اس لیے نہیں کہتا کہ لفظ فحش کی تعریف کے متعلق میں واضح نہیں ہوں۔ . . . میرے خیال میں جن لوگوں کا میلان بدکاری کی طرف ہے، ان کے لیے اس مضمون میں جنسی ترغیب موجود ہے۔ جس شخص کی طبع میں میلان بدکاری نہ ہو، اسے اس مضمون سے جنسی کراہت ہو گی، جنسی ترغیب نہیں ہو گی۔ 'ٹھنڈا گوشت'، کا مطلب مردہ لڑکی ہے۔ میں اس کہانی کو ایک عام جنسی کہانی سمجھتا ہوں۔ یہ جنسی اخلاق خراب نہیں کرتی۔ . . ."

عدالت کی تمام کارروائی ختم ہوئی۔ اب فیصلہ باقی تھا جو میاں اے۔ ایم۔ سعید صاحب سماعت کے دوران میں کئی مرتبہ زبانی سنا چکے تھے۔ شیخ خورشید احمد کو یقین تھا کہ ہم سب کو جرمانہ ہو گا۔

فیصلے کی تاریخ سولہ جنوری (یہی سال) مقرر ہوئی۔

نصیر انور بالکل بے پروا تھا۔ ساری سماعت کے دوران میں وہ ہنستا مسکراتا رہا۔ عارف عبد المتین البتہ سارا وقت بہت پریشان رہے۔ ان کی اس پریشانی کا باعث یہ بھی تھا کہ ان کے محترم والد بڑے ہراساں تھے۔

جب صفائی کی گواہیاں ختم ہوئی تھیں تو میں نے اپنا تحریری بیان داخل کیا تھا۔ اس تحریری بیان کو پڑھ کر، مجھے اچھی طرح یاد ہے، مجسٹریٹ صاحب نے فرمایا تھا: "یہ بیان ہی ملزم کو سزا دینے کے لیے کافی ہے۔ . . ."

تحریری بیان

میں افسانہ "ٹھنڈا گوشت"۔ مطبوعہ ماہنامہ "جاوید"، لاہور کا مصنف ہوں جو استغاثے کے نزدیک عریاں اور فحش ہے۔ مجھے اس سے اختلاف ہے۔ یہ افسانہ کسی بھی نکتۂ نظر سے ایسا نہیں ہے۔

فحاشی کے متعلق بہت کچھ کہا جا چکا ہے اور کہا جا سکتا ہے مگر یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ ادب ہرگز ہرگز فحش نہیں ہو سکتا۔ "ٹھنڈا گوشت" کو اگر ادب کے دائرے سے باہر کر دیا جائے تو اس کے فحش ہونے یا نہ ہونے کا سوال پیدا ہو سکتا ہے مگر یہ افسانہ ایک ادیب کی تصنیف ہے جو ادبِ جدید میں کافی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کا ثبوت اس کی تصانیف ہیں اور وہ مضامین جو قریب قریب ہر ادبی رسالے میں اس کے فن پر شائع ہوئے ہیں۔

اس سے پہلے تین مرتبہ میرے افسانوں کے بارے میں شبہ ہوا تھا کہ وہ فحش ہیں۔ چنانچہ مجھ پر مقدمے چلے، سزائیں ہوئیں لیکن اپیل کرنے پر ہر بار سیشن کورٹ میں مجھے اور میرے افسانوں کو فحاشی کے الزام سے بری کر دیا گیا۔

میرے ایک مقدمے کے سلسلے میں مسٹر ایم۔ آر۔ بھاٹیہ، اڈیشنل سیشن جج کے فیصلے کے یہ الفاظ قابلِ غور ہیں:

> قابلِ غور امر ہے کہ ایسے اشخاص ملزمین کی صفائی میں پیش ہوئے ہیں جو اردو زبان کے عالم ہونے کی حیثیت میں بہت مشہور ہیں، مثال کے طور پر خان بہادر عبدالرحمٰن چغتائی، مسٹر کے۔ این۔ کپور، پروفیسر ڈی۔ اے۔ وی کالج، راجندر سنگھ بیدی اور ڈاکٹر لطیف، پروفیسر ایف۔ سی کالج جو بطور گواہانِ صفائی پیش ہوئے۔ ان سب کی رائے ہے کہ مضمون (بو) میں ایسی کوئی چیز نہیں جو شہوانی حسیات پیدا کرے، بلکہ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ مضمون ترقی پسند ہے اور اردو ادب کے ماڈرن رجحان سے تعلق رکھتا ہے حتیٰ کہ استغاثے کے گواہ نمبر چار بشیر نے دورانِ جرح میں تسلیم کیا کہ مضمون انسان کے اخلاق پر برا اثر نہیں ڈالتا۔

ماتحت عدالتِ فاضلہ نے ہندوستانی نوجوانوں کی تعیش پسند زندگی کا ذکر کرتے ہوئے افسوس کیا ہے اور اس بات پر ماتم کیا ہے کہ ملک میں ہندوستانیوں کا پرانا کیریکٹر نابود ہو رہا ہے۔ ماتحت عدالت کے فاضل جج نے وہ خوبیاں بھی یاد کرائی ہیں جن کے لیے ہم ہندوستانی کبھی مشہور تھے اور نصیحت (بھی) کی ہے کہ نئے فیشنوں کو ختم کر دینا چاہیے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ماتحت عدالتِ فاضلہ کے خیالات ترقی پسند نہیں ہیں۔ ہمیں زمانے کے ساتھ چلنا ہے ——— حسین چیز ایک دائمی مسرت ہے۔ آرٹ جہاں بھی ملے، ہمیں اس کی قدر کرنی چاہیے۔ آرٹ خواہ وہ تصویر کی صورت میں ہو یا مجسمے کی شکل میں، سوسائٹی کے لیے قطعی طور پر ایک پیش کش ہے چاہے اس کا موضوع غیر مستور ہی کیوں نہ ہو۔ یہی کلیہ تحریروں پر بھی منطبق ہوتا ہے۔

جب ملک کے مشہور و معروف آرٹسٹوں اور ادیبوں نے ملزمین کے حق میں کہا ہے تو سارا فیصلہ یہیں ہو جاتا ہے۔ زیرِ بحث مضمون ایسا نہیں کہ جس پر کسی قانونی عدالت میں نکتہ چینی کی جائے۔ اس لیے مجھے اپیل منظور کرنے میں کوئی پس و پیش نہیں۔ جرمانہ اگر ادا کر دیا گیا ہے تو واپس کیا جائے ——— میں اپیل کرنے والوں کو بری کرتا ہوں۔

اس فیصلے سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ آرٹ فحش نہیں ہو سکتا اور کسی فن پارے پر کسی قانونی عدالت میں نکتہ چینی نہیں کی جانی چاہیے۔

کوئی لٹریری پیس یعنی ادب پارہ معیاری یا غیر معیاری ہو سکتا ہے، اس لیے کہ آرٹسٹ، ہو سکتا ہے، اپنا معیار قائم نہ رکھ سکے ——— افسانہ نگار کا ہر افسانہ اس کا شاہکار نہیں ہو سکتا۔

"ٹھنڈا گوشت" کے اسٹینڈرڈ کے بارے میں کہا سنا جا سکتا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ افسانہ میرے دوسرے افسانوں کے پائے کا نہیں ——— یہ کام ادبی نقادوں کا ہے، اور انھیں اس بات کا حق ہے کہ وہ جانچیں، پرکھیں مگر اس افسانے پر کسی صورت میں بھی فحاشی کا الزام نہیں لگایا جا سکتا، اس لیے کہ مصنف کی طرف سے افسانوی ادب میں، اچھا برا جیسا بھی ہے، یہ ایک اضافہ ہے۔ لیکن ایسی صورت میں کہ مجھے اپنی پوزیشن صاف کرنا ہے، آئیے ہم اس افسانے کو اچھی طرح جانچیں کہ اس میں فحاشی کا کوئی پہلو نکلتا ہے یا نہیں:

"ٹھنڈا گوشت" جیسا کہ ظاہر ہے، ایک افسانہ ہے جس کا عقبی منظر یوں تو گزشتہ فسادات ہیں، لیکن دراصل جس کی بنیاد انسانی نفسیات پر قائم ہے ——— اور انسانی نفسیات کا جنس سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔

افسانے میں دو کردار ہیں: ایشر سنگھ اور اس کی داشتہ یا بیوی کلونت کور۔

دونوں ٹھیٹ قسم کے گنوار سکھ ہیں ——— دونوں جنسی لحاظ سے بہت تگڑے ہیں۔ یوں کہنا چاہیے کہ ایشر سنگھ کو جنسی تشفی صرف کلونت کور ایسی عورت ہی سے ت کور کو جنسی تشفی صرف ایشر سنگھ ایسے مضبوط اور توانا مرد ہی سے مل سکتی ہے ——— دونوں کی جنسی [illegible] بڑی ہموار تھی، لیکن ایک ایسا وقت آتا ہے جب کلونت کور محسوس کرتی ہے کہ ایشر سنگھ تبدیل ہو گیا ہے، اس کی جنسی محبت میں پہلی سی توانائی نہیں رہی، وہ اس سے بے رخی برت رہا ہے، کسی اور عورت سے اس نے ناطہ [illegible] ہے ——— اصل بات یہ تھی کہ ایشر سنگھ ایک زبردست نفسیاتی ردِ عمل کا شکار ہو جاتا ہے جس کے باعث اس کی جنسی توانائی قریب قریب مفلوج ہو چکی تھی۔ وہ لوٹ مار کے دوران میں قتل و غارت کرنے کے بعد ایک نوجوان مسلم دوشیزہ اٹھا لایا تھا کہ تبدیلی کے طور پر وہ اس سے جنسی حظ اٹھائے مگر جب اس نے ایسا کرنا چاہا تو اسے معلوم ہوا کہ لڑکی دہشت کے مارے اس کے کندھوں پر ہی مر چکی ہے۔ اس کے سامنے ایک ٹھنڈی لاش پڑی تھی۔ اس کی تپتی ہوئی شہوانی خواہشات کے سامنے ٹھنڈے گوشت کا لوتھڑا پڑا تھا۔ اس کا ایشر سنگھ کو کچھ ایسا زبردست احساس ہوا کہ وہ نفسیاتی طور پر نامرد ہو گیا۔

اگر ایشر سنگھ کا سابقہ ٹھنڈی عورتوں سے پڑا ہوتا، اگر ایشر سنگھ خود ٹھنڈا مرد ہوتا تو اس پر اتنا زبردست نفسیاتی ردِ عمل نہ ہوتا، مگر جیسا کہ اس کا کردار پینٹ کیا گیا ہے، وہ جنسی لحاظ سے بہت ہی توانا تھا اور اس کا جنسی رشتہ بھی ایک ایسی عورت سے تھا جو ہر لحاظ سے اس کا ہم پایہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اوپر بیان کیے گئے حادثے نے اسے جنسی لحاظ سے بالکل نکما کر دیا۔

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ قتل و غارت نے اور لوٹ مار نے ایشر سنگھ پر کوئی اثر نہیں کیا تھا ——— اس نے کئی انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا مگر اس کے ضمیر پر احساس کی ایک ہلکی سی خراش بھی نہیں آئی تھی، لیکن جب وہ لڑکی کی ٹھنڈی لاش پر جھکا تو اس کی مردانگی غائب ہو گئی۔

"ٹھنڈا گوشت" کے بطن میں جو کچھ بھی ہے، ظاہر ہے کہ فحش نہیں۔ عنوان ہی ایک بیّن ثبوت ہے کہ افسانہ پڑھنے والوں کے دل و دماغ میں شہوت کی گرم لہریں نہیں دوڑائے گا ——— جو حادثہ ایشر سنگھ کو پیش آیا، وہ کیسے کسی قاری کو شہوانی جذبات کی طرف مائل کر سکتا ہے؟

ایشر سنگھ کا اندازِ گفتگو اس کا اپنا ہے۔ ہزاروں آدمی روزمرہ کی زندگی میں وہ الفاظ استعمال کرتے ہیں جو مصنف نے اس کے منہ سے کہلوائے ہیں۔ اس کی حرکات غیر فطری نہیں ——— یہی کچھ کلونت کور کے متعلق کہا جا سکتا ہے۔

استغاثے کے فاضل وکیل نے خاص طور پر اس بات پر زور دیا ہے کہ ایشر سنگھ کے مکالموں میں گالیاں استعمال کی گئی ہیں۔ میں یہاں گالی کی نفسیات پر بحث نہیں کروں گا، مگر یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ وہ الفاظ جو

استغاثے کے وکیل کے نزدیک گالی ہیں، اصل میں گالی نہیں ہیں۔

میں یہاں گالی کی ایک دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔

اردو کے مشہور شاعر مرزا غالب، مرزا شہاب الدین خاں صاحب کے نام ایک رقعے میں لکھتے ہیں:

یہ اشعار جو تم نے بھیجے ہیں، خدا جانے کس ولد الزنا نے داخل کر دیے ہیں۔ اگر یہ شعر متن میں پائے بھی جاویں تو یوں سمجھنا، کسی ملعون زن جلب نے اصل کلام کو چھیل کر یہ خرافات لکھ دیے ہیں۔

——— اردوئے معلیٰ: صفحہ ۲۱۷

مرزا شہاب الدین کے نام ایک اور خط میں ارشاد ہوتا ہے:

میاں وہ قاضی مسخرہ تو چوتیا ہے۔

——— اردوئے معلیٰ: صفحہ ۲۱۸

گالی کے یہ نمونے تو ہو گئے، لیکن اگر کوئی شخص گفتگو کے دوران میں یہ کہے: "میں بھی عجیب چوتیا ہوں کہ آپ یہاں ہیں اور میں آپ کو لاہور ڈھونڈتا پھرا۔" تو ظاہر ہے، لفظ "چوتیا" گالی نہیں ہے ——— "سالا" ہمارے یہاں بہت بڑی گالی متصور کی جاتی ہے لیکن بمبئی میں لفظ "سالا" کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ عام گفتگو میں زبان ایسے کئی فقرے آپ کے سننے میں آئیں گے:

ہمارا باپ سالا بڑا اچھا آدمی تھا۔

سالا ہم سے مِسٹیک ہو گیا۔

سالا کیسی بات کرتا ہے۔

ماں بہن کی گالی یو۔پی اور پنجاب میں گفتگو میں عام استعمال ہوتی ہے، اور کسی کے کان کھڑے نہیں ہوتے۔ خاص خاص گالی اکثر لوگوں کا تکیہ کلام بھی بن جاتی ہے ——— ایشر سنگھ بھی چند گالیوں کو تکیہ کلام کے طور پر ہی استعمال کرتا ہے، اس لیے استغاثے کے فاضل وکیل کا اس نکتے پر زور دینا بالکل بیکار ہے۔

اس کے علاوہ یہ اہم بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ ایشر سنگھ جیسے اُجڈ اور گنوار آدمی سے شائستہ کلامی کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے۔ اس کے منہ میں اگر مصنف نے مہذب اور شائستہ الفاظ ڈالے ہوتے تو افسانے میں حقیقت نگاری کا خاتمہ ہو جاتا، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ افسانہ ایک نہایت ہی بھونڈی شکل اختیار کر لیتا اور آرٹ کی سطح سے بہت ہی نیچے خرافات کے کھڈ میں جا گرتا۔

سوال یہ ہے کہ جو چیز جیسی ہے، اسے من و عن کیوں نہ پیش کیا جائے۔ ٹاٹ کو اطلس کیوں بنایا جائے۔ غلاظت کے ڈھیر کو عود و عنبر کے انبار میں کیوں تبدیل کیا جائے ——— حقیقت سے انحراف کیا بہتر انسان بننے میں ہمارا ممد و معاون ہو سکتا ہے۔ ہرگز نہیں ——— پھر ایشر سنگھ کے کردار اور اس کی گفتار پر اعتراض کیا معنی رکھتا ہے۔

ایشر سنگھ گندہ ذہن سہی، افسانے کا موضوع گندہ سہی، لیکن کیا اس کو پڑھنے کے بعد ہمیں انسانیت

کی وہ رمق دکھائی نہیں دیتی جو ایشر سنگھ کے سیاہ قلب میں خود اس کا مکروہ فعل پیدا کرتا ہے —— اور یہ ایک صحت مند چیز ہے کہ اس افسانے کا مصنف انسانوں اور انسانیت سے مایوس نہیں ہوا۔ اگر مصنف نے ایشر سنگھ کے دل و دماغ پر نفسیاتی ردِ عمل پیدا نہ کیا ہوتا تو یقیناً "ٹھنڈا گوشت" ایک نہایت ہی مہمل چیز ہوتی۔

مجھے افسوس ہے کہ وہ تحریر جو انسانوں کو بتاتی ہے کہ وہ انسان سے حیوان بن کر بھی انسانیت سے علیحدہ نہیں ہو سکتے، فحش اور شہوت کو اُبھارنے والی سمجھی جا رہی ہے —— لطیفہ تو یہ ہے کہ افسانے میں ایک انسان کو اس کی رہی سہی انسانیت ایک بہت بڑی سزا دیتی ہے۔

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ایشر سنگھ کو اپنی چری ہوئی گردن کا بالکل احساس نہیں، اس کو تو آخری سانس تک صرف ایک ہی بات ستاتی رہتی ہے: وہ ایک ٹھنڈی لاش سے زنا کرنے والا تھا۔

فرانس میں مشہور ناول نگار فلابیئر کی تصنیف "مادام بوواری" پر فحاشی کے الزام میں مقدمہ چلا تو وکیل صفائی موسیو سینار نے فاضلانہ بحث کے دوران میں کہا: حضرات! یہ کتاب جو بقول وکیل استغاثہ شہوانی جذبات کو بھڑکاتی ہے، موسیو فلابیئر کے وسیع مطالعے اور غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ اس نے اپنی توجہ متین فطرت کی وساطت سے ایسے ہی متین اور ملول مضامین کی طرف منعطف کی ہے۔ وہ ایسا آدمی نہیں ہے جس کے خلاف وکیل استغاثہ نے ہیجان خیز تصویروں کی نقاشی کے الزام میں جگہ جگہ اپنی تقریر میں زہر اُگلا ہے —— میں پھر دوہراتا ہوں کہ فلابیئر کی فطرت میں بے انتہا سنگینی، شدید سنجیدگی اور بے پناہ ملال بھرا پڑا ہے۔

میں اپنے متعلق صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں ایک شریف خاندان کا فرد ہوں۔ اتفاق سے میرا پیشہ تصنیف و تالیف ہے۔ اپنی فطرت، اور جو تعلیم و تربیت مجھے ملی ہے، اس کی بدولت میں نے آج تک سستا اور سوقیانہ ادب پیش نہیں کیا۔ اُردو کے جدید ادب سے جو لوگ ذرا سا بھی واسطہ رکھتے ہیں، ان کو میرے ادبی مقام کا علم ہے —— "ٹھنڈا گوشت" میں فلابیئر کی فطرت کی بے انتہا سنگینی اور شدید سنجیدگی شاید نہ ہو لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ بے پناہ ملال سے بھرا پڑا ہے۔

اور جب سوال ملال کا ہو تو شہوت کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔

اب افسانے کو اس پہلو سے بھی دیکھا جائے کہ مصنف کی نیت کیا ہے۔

رائے صاحب لالہ سنت رام کی عدالت میں اپنے افسانے "دھواں" کے سلسلے میں صفائی کا بیان دیتے ہوئے میں نے کہا تھا: تحریر و تقریر میں، شعر و شاعری میں، سنگ سازی و صنم تراشی میں فحاشی تلاش کرنے کے لیے سب سے پہلے اس کی ترغیب ٹٹولنی چاہیے۔ اگر یہ ترغیب موجود ہے، اگر اس کا ایک شائبہ بھی نظر آ رہا ہے تو وہ تحریر، وہ تقریر، وہ شعر، وہ بت قطعی طور پر فحش ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسی کوئی ترغیب زیرِ بحث افسانے میں نہیں ہے۔ میں افسانے کا تجزیہ اوپر کر چکا ہوں جو یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ مصنف کی نیت میں کوئی فرق نہیں ہے اور اس نے محض ایک نفسیاتی حقیقت کو اس کے صحیح روپ میں، افسانے کی صورت میں پیش کیا ہے۔

"ٹھنڈا گوشت" پڑھ کر اگر کسی صاحب کے جذبات برانگیختہ ہوں تو انھیں کسی ذہنی معالج سے رجوع کرنا چاہیے ——— "دھواں" ہی کی صفائی کے سلسلے میں مَیں نے اپنے بیان میں کہا تھا: ایک مریض جسم، ایک بیمار ذہن ہی ایسا غلط اثر لے سکتا ہے۔ جو لوگ روحانی، ذہنی اور جسمانی لحاظ سے تندرست ہیں، اصل میں ان ہی کے لیے شاعر شعر کہتا ہے، افسانہ نگار افسانہ لکھتا ہے اور مصور تصویر بناتا ہے۔ . . . . میرے افسانے تندرست اور صحت مند لوگوں کے لیے ہیں، نارمل انسانوں کے لیے جو عورت کے سینے کو عورت کا سینہ ہی سمجھتے ہیں، جو عورت اور مرد کے رشتے کو استعجاب کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ . .

"ٹھنڈا گوشت" بھی دوالی ادب پاروں کی طرح صحت مند دماغوں کے لیے ہے، ایسے دماغوں کے لیے نہیں جو معصوم اور پاکیزہ چیزوں میں بھی شہوت کرید لیتے ہیں ——— اگر کوئی عورت لوہے کی مشین کی حرکت سے شہوانی لذت حاصل کرتی ہے تو کیا لوہے کی مشین یا اس کی حرکت پر سفلی جذبات برانگیختہ کرنے کا الزام دھرا جائے گا۔ دنیا میں تو ایسے اشخاص بھی موجود ہیں جو مقدس کتابوں سے بھی شہوانی لذت حاصل کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا تو علاج ہونا چاہیے۔

امریکہ میں مشہور مصنف جیمز جوائس کی تصنیف "یولی سیز" کو فحاشی سے بری کرتے ہوئے جج وولزے نے اپنے فیصلے میں لکھا تھا: ایک خاص کتاب ایسے جذبات اور خیالات پیدا کر سکتی ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ عدالت کی رائے میں یہ دیکھ کر ہو گا کہ اوسط درجے کے جنسی جبلتیں رکھنے والے آدمی پر اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔ ایسے آدمی پر جسے فرانسیسی "معمولی قسم کی حسیات رکھنے والا انسان" کہتے ہیں، اور جس کی حیثیت قانونی تفتیش کی اس شاخ میں ایک فرضی عامل کی ہوتی ہے جیسے عدالتِ خفیفہ کے مقدموں میں "سمجھ بوجھ والے آدمی" کی حیثیت ہوتی ہے یا رجسٹریشن کے قانون میں ایجاد کے مسئلے کے متعلق "فن کے ماہر" کی۔

قانون کا تعلق صرف اوسط درجے کے آدمی سے ہے، چنانچہ "ٹھنڈا گوشت" کے متعلق کوئی فیصلہ مرتب کرنے سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کے مطالعے سے ایک اوسط درجے کی جنسی جبلتیں رکھنے والے آدمی کے دل و دماغ پر کیا اثر ہوتا ہے۔

مشہور امریکی ناول نگار ارسکائن کالڈول کی تصنیف "گاڈز لٹل ایکر" کو فحاشی کے الزام سے بری کرتے ہوئے عدالت نے اپنے فیصلے میں لکھا تھا: مصنف کا مقصد ایک سچی تصویر پینٹ کرنا تھا۔ ایسی تصویروں میں بعض ضروری تفصیلوں کا آ جانا لازمی امر ہے، اور چونکہ ایسی تفصیلوں کا گہرا تعلق زندگی کے جنسی پہلو سے ہوتا ہے، اس لیے انھیں بے باکانہ صاف گوئی کے ساتھ بیان کر دیا جاتا ہے۔ عدالت یہ حکم صادر نہیں کر سکتی کہ

ایسی تصویریں سرے سے بنائی ہی نہ جائیں —— کرداروں کی زبان بلا شبہ بھدی اور گندی ہے مگر عدالت مصنف سے ان پڑھ اور غیر مہذب لوگوں کے منہ میں شائستہ زبان ڈال دینے کا مطالبہ بھی نہیں کر سکتی۔

"ٹھنڈا گوشت" ایک سچی تصویر ہے۔ اس میں کوئی ابہام نہیں۔ بڑی ہی بے باکانہ صاف گوئی سے اس میں ایک نفسیاتی حقیقت کی نقاب کشائی کی گئی ہے —— اگر اس میں کہیں گندگی اور غلاظت ہے تو اسے مصنف کے ساتھ نہیں، افسانے کے کرداروں کی ذہنی سطح کے ساتھ منسوب کرنا چاہیے —— کسی تحریر کے چند الفاظ اگر چمٹے سے اٹھا کر لوگوں کو دکھائے جائیں کہ یہ فحش ہیں تو اس سے کوئی صحیح اندازہ نہیں ہوگا۔ ان الفاظ کی جداگانہ اشاعت قابلِ گرفت ہو سکتی ہے، بالکل اسی طرح جیسے غالب، میر، ارسٹوفین، چاسر، بوکیشیو بلکہ کتابِ مقدس تک کے بعض مقامات کو قابلِ تعزیر گردانا جا سکتا ہے، تاہم کسی تحریر کو سمجھنے کے لیے اسے مجموعی طور ہی سے دیکھنا پڑے گا۔

مجھے آخر میں یہ کہنے کی اجازت دی جائے کہ مجھے انتہائی افسوس ہے، استغاثے کی طرف سے میری تصنیف "ٹھنڈا گوشت" پر کوئی ادبی تنقید نہیں ہوئی۔ اگر ایسا ہوتا تو مجھے دلی مسرت ہوتی۔ افسانے میں اگر کوئی فنی کمزوری رہ گئی تھی، بیان میں اگر کوئی سقم تھا، انشا میں اگر کوئی خامی تھی تو مجھے اس کا علم ہو جاتا اور میں کچھ حاصل کر پاتا۔ لیکن میں تو یہاں ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا ہوں اور ایک نہایت ہی گھناؤنے الزام کا منہ دیکھ رہا ہوں کہ میں نے اپنی تصنیف کے ذریعے سے لوگوں کے شہوانی جذبات ابھارے ہیں —— اس الزام کے خلاف میرے دل سے احتجاج کے سوا اور کیا چیز نکل سکتی ہے۔

حیرت ہے کہ "ٹھنڈا گوشت" پڑھ کر قاری کا ذہن خوف و نفرت میں ملفوف ہونے کی بجائے شہوت سے ملوث ہو سکتا ہے۔

اور بھی حیرت ہے کہ ایشر سنگھ کو جو ہولناک سزا ملی، وہ پڑھنے والے کے دل و دماغ میں شہوانی جذبات بیدار کر سکتی ہے۔

سولہ جنوری آن پہنچی۔

شیخ سلیم بہت پریشان تھا۔ اس پریشانی کے باعث اس نے زیادہ پینا شروع کر دی۔ نصیر انور حسبِ معمول بے پروا تھا۔ عزیزی عارف عبدالمتین کا حلق پہلے سے زیادہ خشک ہو گیا تھا۔

سولہ جنوری کی صبح کو پانچ سو روپے جیب میں ڈال کر میں ضلع کچہری روانہ ہوا۔ شیخ سلیم پہلے ہی سے وہاں موجود تھا۔ وہ صبح سے پی رہا تھا۔ بوتل پتلون کی جیب میں تھی۔ خود بہت مضطرب تھا لیکن بار بار مجھے تسلی دیتا تھا: "بھائی جان، فکر کی کوئی بات نہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں یہ سُن کر مسکرا دیتا۔

اتنے میں نصیر انور اور عارف عبدالمتین بھی آ گئے۔ عارف نے مجھ سے بڑے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا: "منٹو صاحب، آپ کا کیا خیال ہے، کیا ہو گا؟"

میں نے جواب دیا: "وہی جو منظورِ خدا ہو گا . . ."

مجسٹریٹ صاحب آ چکے تھے مگر فیصلہ سُنانے کے آثار دکھائی نہیں دیتے تھے —— گیارہ بج گئے، بارہ بج گئے، پانی پی پی کر ہمارے پیٹ اپھر گئے مگر آواز نہ پڑی۔ اتنے میں میرے ایک مخبر نے مجھے بتایا کہ فیصلہ تیار ہے مگر میاں اے۔ ایم۔ سعید اس میں شاید کچھ ترمیم کرنا چاہتے ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد پتا چلا کہ میاں صاحب غائب ہیں یعنی اپنے کمرے میں موجود نہیں ہیں اور یہ کہ انھوں نے صبح سے کسی مقدمے کو ہاتھ تک نہیں لگایا ہے —— ایک صاحب نے یہ کہا کہ وہ بہت پریشان ہیں۔

غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔

تھوڑی دیر کے بعد مخبر پکّی خبر لایا —— ایک طرف لے جا کر اُس نے مجھ سے سرگوشی میں کہا: "میں فیصلہ دیکھ آیا ہوں . . . جلدی جلدی میں دیکھا ہے اور صرف چند آخری سطریں۔ آپ کو یقیناً سزا ہو گی اور جرمانہ بھی . . . آپ کے نام کے آگے یہ لکھا ہے: ... and sentence him to undergo...

اس کے آگے جگہ خالی ہے۔ دوسرے ملزموں کو صرف جرمانہ ہو گا۔ میں جاتا ہوں اور ضامن کا بندوبست کرتا ہوں . . ."

میں سوچنے لگا، سزا کتنی ہو گی؟ ایک ماہ کی، دو ماہ کی یا چند دنوں کی؟

مَیں نے کسی سے بات تک نہ کی البتہ شیخ خورشید صاحب کو سب کچھ بتا دیا۔ آپ نے فوراً ضمانت کے کاغذات تیار کر لیے اور مجھ سے کہا: "گھبرائیے نہیں منٹو صاحب، سزا زیادہ سے زیادہ دس بارہ یوم کی ہو گی۔" لیکن پھر کچھ سوچ کر تشویش ناک لہجے میں کہا: "کہیں ایسا نہ ہو، وہ ضمانت لینے سے انکار کر دے . . ."

یہ سُن کر مجھے بہت تشویش ہوئی کیونکہ مجسٹریٹ صاحب کا رویّہ شروع ہی سے مخاصمانہ رہا تھا لیکن کچھ کیا بھی تو نہیں جا سکتا تھا۔ خاموش دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہا۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے شیخ سلیم کو ساری بات بتا دی۔ میرے جی کا بوجھ تو کسی قدر ہلکا ہو گیا مگر شیخ بیچارہ اور زیادہ مضطرب ہو گیا، لیکن اس نے تسلی دینے کی خاطر مجھ سے کہا: "کچھ فکر نہ کرو بھائی جان، میں ٹیکسی لے کر وہاں جیل میں پہنچوں گا . . . روپیہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ میں ایسے معاملے نبیڑنا جانتا ہوں . . . میرا خیال

ہے، آپ اس وقت ایک بڑا پگ لگا لیجیے۔ ۔ ۔"

میں نے کہا: "نہیں شیخ صاحب، شام کو۔"

شیخ صاحب نے کہا: "تو آپ مطمئن رہیں، میں آپ کو وہاں پہنچا دوں گا۔ ۔ ۔"

یہ سن کر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔

ایک بج چکا تھا۔ شیخ سلیم، نصیر انور اور میں نے گورنمنٹ کالج کے ہوسٹل کے سامنے گھاس کے میدان پر بیٹھ کر آلو چھولے کھائے اور اس خیال سے کہ کہیں آواز نہ پڑ جائے، جلدی لوٹ آئے اور فیصلے کا انتظار کرنے لگے۔

نصیر انور اور عارف عبدالمتین سے میں نے اشارتاً کئی بار کہہ دیا تھا کہ وہ جرمانے کا بندوبست کر لیں تاکہ عین وقت پر پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے ——— شیخ سلیم پی کر اسکیمیں سوچ رہا تھا کہ وہ جیل میں مجھ تک کیسے پہنچے گا اور میری آسائش کا بندوبست کن ذرائع سے کرے گا۔

عزیزی مشتاق احمد اپنے ایک دولت مند دوست شریف صاحب کو میری ضمانت دینے کے لیے پکڑ لائے تھے۔ یہ غریب بھی ہماری طرح کھڑے بور ہو رہے تھے۔ شیخ سلیم کو غصہ تھا کہ جب وہ موجود ہے تو کوئی اور ضمانت دینے کے لیے کیوں لایا گیا ہے۔ میں نے ان سے کہا: "شیخ صاحب، اگر آپ کو ضمانت دینے ہی کا شوق ہے تو دو ملزم اور موجود ہیں۔"

شیخ صاحب اس وقت اچھے موڈ میں تھے، وہ میری یہ بات سن کر مسکرا دیے اور ایک پگ اور چڑھا کر اسکیمیں سوچنے میں محو ہو گئے۔ ان کو اس بات کی بہت فکر تھی کہ منٹو کی شام خراب ہو جائے گی۔

پانچ بج گئے۔ تشویش اور تردد بڑھتا گیا۔ نصیر بالکل بے پروا تھا جیسے کچھ ہونے والا نہیں۔ اس کی یہ بے پروائی قابلِ رشک تھی۔ عارف عبدالمتین کا حلق اب اتنا خشک ہو چکا تھا کہ اس نے بولنا بند کر دیا تھا ——— ساڑھے پانچ ہوئے تو ہمیں بلایا گیا۔ فوراً شیخ خورشید صاحب کو اطلاع دی گئی۔ وہ بھاگے بھاگے آئے اور ہم سب حاضرِ عدالت ہوئے۔

میاں اے۔ ایم۔ سعید دانتوں تلے قلم دبائے، سامنے میز پر فیصلے کے کاغذ رکھے سوچ میں غرق بیٹھے تھے۔ شیخ خورشید کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بے حد مضطرب ہیں۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ شیخ سلیم کا رنگ زرد تھا۔ عارف عبدالمتین بار بار ہونٹوں پر خشک زبان پھیر رہا تھا ——— نصیر انور اسی طرح بے پروا تھا۔

پریس رپورٹر موجود تھے۔ کاغذ پنسل ہاتھ میں لیے وہ بڑی بے چینی سے فیصلے کا انتظار کر رہے تھے۔ چند لمحات مکمل سکوت طاری رہا، اس کے بعد میاں اے۔ ایم۔ سعید صاحب کھنکارے، دانتوں کی گرفت سے قلم آزاد کیا، نب کو روشنائی دکھائی، فیصلے کے کاغذ الٹ پلٹ کیے اور بہت سوچ سوچ کر ایک کاغذ پر خالی جگہیں پُر کیں۔ اس کے بعد میرے بارے میں اپنا فیصلہ صادر فرمایا: تین مہینے قیدِ بامشقت اور تین سو روپے جرمانہ۔ عدمِ ادائیگی جرمانہ کی صورت میں اکیس یوم مزید قیدِ بامشقت۔

شیخ سلیم کا رنگ اور زیادہ زرد ہو گیا۔ اس نے نگاہوں ہی نگاہوں میں مجھے تسلی دی گویا یہ کہہ رہا ہو:

کچھ فکر نہ کرو، میں وہاں جیل میں ضرور پہنچوں گا۔ ۔ ۔

میں یہ سوچنے لگا تھا کہ مجسٹریٹ ضمانت قبول کرے گا یا نہیں ——— تھوڑے وقفے کے بعد میاں اے۔ ایم۔ سعید نے دوسری خالی جگہیں پُر کیں اور بقایا دو ملزمین کے بارے میں فیصلہ سُنایا: تین تین سو روپیہ جرمانہ۔ عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں اکیس یوم قید بامشقت۔

میں نے جرمانہ داخل کر دیا۔ شیخ خورشید صاحب نے میری ضمانت کے کاغذ پیش کیے تو میاں اے ایم۔ سعید نے کہا: "میں اگر ضمانت منظور کرتا ہوں تو سزا کا مطلب ہی فوت ہو جاتا ہے۔ ۔ ۔"

شیخ خورشید صاحب نے یہ استدلال پیش کیا: "آپ کا ارشاد درست۔ ملزم نے جرمانہ ادا کر دیا ہے جو اپیل منظور ہونے کی صورت میں یقیناً واپس مل جائے گا۔ لیکن وہ دو تین دن جو ضمانت ہونے سے پہلے میرا مؤکل جیل میں کاٹے گا، اپیل منظور ہونے پر کیا اسے واپس مل جائیں گے۔ ۔ ۔"

استدلال بہت معقول تھا مگر پھر بھی میاں اے۔ ایم۔ سعید کچھ دیر اڑے رہے، آخر میں انھوں نے کرم فرمائی کی اور میری ضمانت قبول کر لی۔

عارف عبدالمتین کے والد صاحب نے اُن کا جُرمانہ ادا کر دیا ——— اب رہ گئے نصیر انور۔ اُن سے پوچھا گیا تو انھوں نے بڑی بے پروائی سے کہا: "میرے پاس تو فی الحال کچھ بھی نہیں ہے۔ ۔ ۔"

مجسٹریٹ صاحب نے حکم دیا کہ ہتھکڑی لگاؤ اور جیل میں بھیج دو۔

نصیر انور اسی طرح خاموش کھڑا رہا۔

میرے پاس دو سو روپے موجود تھے۔ چودھری نذیر، مالک "نیا ادارہ" سے میں نے کہا کہ وہ ایک سو روپے کا بندوبست کر دیں مگر اُن سے بندوبست نہ ہو سکا۔ سپاہی ہتھکڑیاں لیے نصیر کی پیٹھ پیچھے کھڑا تھا۔ ان کی چھنکار عدالت کے کمرے میں گونج رہی تھی۔ باہر پولیس وین تھی، یعنی سارے لوازمات موجود تھے۔

آخر خورشید صاحب ہی کام آئے۔ آپ نے میاں اے۔ ایم۔ سعید صاحب سے بڑے مناسب و موزوں الفاظ میں درخواست کی کہ وہ نصیر انور کی ضمانت لے لیں، جرمانے کا روپیہ وہ کل صبح داخل کر دیں گے۔ مجسٹریٹ صاحب نے یہ درخواست قبول کر لی۔ اب ضامن کا سوال تھا۔ شیخ خورشید صاحب نے پوچھا: "ان کی ضمانت کون دے گا؟"

کوئی آگے نہ بڑھا۔ اچانک شیخ سلیم نے جو اب تک نشے میں دُھت ہو چکے تھے، شیخ خورشید صاحب سے مخمور لہجے میں کہا: "نصیر صاحب کی ضمانت میں دیتا ہوں۔ ۔ ۔"

میرا دل دھڑکنے لگا ——— اگر عدالت کو معلوم ہو گیا کہ شیخ صاحب پیے ہوئے ہیں تو ان کی ضمانت کون دے گا؟

مجھے یقین تھا کہ وہ ضرور دھر لیے جائیں گے اور سارا معاملہ چوپٹ ہو جائے گا ——— میں اسی خوف کے مارے کمرے سے باہر چلا گیا۔

میں بار بار اندر جھانک کر دیکھتا کہ شیخ سلیم گرفتار ہوئے ہیں یا کہ نہیں لیکن خیریت گذری۔ نصیر انور کی ضمانت ہو گئی ——— شیخ صاحب جھومتے ہوئے باہر نکلے اور مجھے گلے لگا کر رونے لگے: "اللہ میاں نے میرے بھائی کو بچا لیا۔" یہ کہہ کر آپ نے جیب سے بوتل نکال کر ایک گھونٹ بھرا جو کہ آخری تھا: "چلو بھئی چلیں،

کہیں دکان بند نہ ہو جائے . . .‘‘

نصیر انور بہت ممنون و متشکر تھا - بار بار شیخ سلیم کا شکریہ ادا کرتا تھا - شیخ صاحب نے اُس سے کہا:

’’شکریہ ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں - میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے - آپ میرے دوست کے دوست ہیں . . .‘‘

•

اب سیشن میں اپیل دائر کرنے کی تیاریاں شروع ہوئیں ——— میاں اے - ایم - سعید کے فیصلے کی نقل حاصل کرنے کے لیے درخواست دی گئی - جب نقل نہ ملی تو درخواست کے ساتھ نو ’’پہیے‘‘ لگائے گئے، نقل فوراً مل گئی -

میاں صاحب کا فیصلہ انگریزی میں تھا - ذیل میں اُس کا اردو ترجمہ درج ہے :

فیصلہ

ایک اُردو رسالہ بہ نام "جاوید" کے ایڈیٹر عارف عبدالمتین اور اس کے پبلشر نصیر انور کو معہ ایک مصنف مسمّیٰ سعادت حسن منٹو کو میرے پاس مقدمہ زیرِ دفعہ ۲۹۲ پی-پی-ایس کے لیے بھیجا گیا ہے۔ مؤخر الذکر ملزم کے خلاف یہ الزام ہے کہ وہ ایک فحش کہانی جس کا عنوان "ٹھنڈا گوشت" ہے، کا مصنف ہے اور جو مذکورہ بالا رسالہ کے ایک خاص نمبر میں شایع ہوئی ہے۔ دوسرے دو ملزموں کے خلاف یہ الزام ہے کہ انھوں نے اس کہانی کو مندرجہ بالا انداز میں شایع کرنے کا جرم کیا ہے۔

رسالہ "جاوید" کا خاص نمبر مارچ ۱۹۴۹ء میں شایع ہوا تھا۔ یہ سیّد ضیاء الدین مترجم پریس برانچ، حکومتِ پنجاب کے علم میں آیا جو اس مقدمہ میں گواہ استغاثہ ۳ کی حیثیت سے پیش ہوا ہے۔ اس کا یہ فرض ہے کہ وہ کسی بھی طبع شدہ چیز میں کوئی فحش مواد محسوس کرے تو اس کے بارے میں حکومتِ پنجاب کو مطلع کرے۔ اس کے خیال میں مذکورہ بالا ایڈیشن میں شایع شدہ کہانی بعنوان "ٹھنڈا گوشت" فحش تھی، چنانچہ اس نے حکومتِ پنجاب کی توجہ اس طرف مبذول کروائی اور اس سلسلے میں قانونی کارروائی کے لیے کہا۔

اس کہانی کی تصنیف اور خاص نمبر میں اس کی اشاعت سے انکار نہیں کیا گیا ہے، اور نہ پہلے دو ملزم رسالے کے مدیر اور ناشر ہونے سے منکر ہیں۔ لہٰذا اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ کہانی بعنوان "ٹھنڈا گوشت" فحش ہے یا نہیں۔

استغاثہ نے مذکورہ رسالے کے خاص نمبر کو پیش کیا ہے جو ریکارڈ میں Ex.P.F. کی حیثیت سے درج کیا گیا ہے۔ کہانی جو اس قانونی چارہ جوئی کا موضوع ہے، اس شمارے کے صفحہ ۸۰ سے ۹۳ تک چھپی ہے۔ میں نے نہایت غور سے اس کہانی کو پڑھا ہے جو موضوع کی تشکیل کرتی ہے اور دیکھا ہے کہ اس (کہانی) میں گندہ طرزِ بیان اور ناشائستہ گالیاں استعمال کی گئی ہیں۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ اس کہانی میں کئی شہوت پرستانہ مقامات پیش کیے گئے ہیں اور جنسی اشارات کا اکثر ذکر کیا گیا ہے۔

یہ طے کرنے کے لیے کہ آیا کوئی تصنیف، مثلاً زیرِ بحث کہانی، فحش ہے یا نہیں، ضروری ہے کہ ایک معیار مقرر کیا جائے جس سے فحاشی کی تمیز کی جا سکے۔

۳ کیو-بی (۱۸۶۸ء) میں ہکلن رپورٹ میں اسی موضوع کے ایک مشہور مقدمے میں لارڈ کوک برن جی-جے نے صفحہ ۳۶۰ تا صفحہ ۳۷۱ پر فحاشی کا یہ معیار مقرر کیا تھا: اس قسم کا الزام زدہ مواد جوان لوگوں کو بد اخلاقی اور بد چلنی کی ترغیب دے جن کے اذہان اس قسم کے

مخرب اخلاق اثرات قبول کر سکتے ہوں اور جن کے ہاتھوں میں اس قسم کا مواد پہنچ سکتا ہو ——— معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی تمام عدالت ہائے عالیہ ہمیشہ اس معیار کی تقلید کرتی رہی ہیں۔ اس معیار سے یہ ظاہر ہے کہ قانون میں مستعملہ عریانی اس ماحول سے متعلق ہے جس میں کہ یہ جانچی جاتی ہے، (یعنی) وہ باتیں جو ایک پاکستانی کے اخلاق کے لیے ضرر رساں خیال کی جائیں۔ جہاں تک ایک فرانسیسی کا تعلق ہے، (وہ باتیں) بالکل بے ضرر سمجھی جاسکتی ہیں ——— ہر سوسائٹی کے اپنے اخلاقی معیار ہوتے ہیں اور وہ چیزیں جو ایک سوسائٹی کا اخلاقی توام خیال کی جاتی ہیں، بعض اوقات اسی دوسری سوسائٹی کے معیار کے مطابق غیر اخلاقی ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح اظہار کے بعض اسالیب کا اثر مختلف سوسائٹیوں کے افراد پر مختلف ہوتا ہے، خواہ یہ اظہار مخالف معیاروں کے نزدیک غیر اخلاقی ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے زیر بحث کہانی کے فحش یا غیر فحش ہونے کا فیصلہ پاکستان کے مروجہ اخلاقی معیاروں کے پس منظر پر کرنا ہوگا، اور اس اثر کے مطابق جو اس قسم کی تحریر اس سوسائٹی میں رہنے والے لوگوں کے اذہان پر ڈالے گی۔

لارڈ کوک برن کا قائم کردہ معیار ایک مکمل اور جامع تعریف نہیں ہے۔ یہ جیسا کہ اس کا مفہوم ظاہر کرتا ہے، صرف ایک معیار ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور بھی معیار ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک وہ رجحان ہے (یہ الزام زدہ مواد میں موجود ہے) جو قارئین کے اخلاقی احساسات کو ٹھیس پہنچاتا ہے۔ یہ معیار بھی قارئین کے اخلاق پر منحصر ہے۔

استغاثہ نے ابتدا میں صرف پانچ گواہ پیش کیے اور کیس بند کر دیا۔

گواہ استغاثہ نمبر ایک مسٹر محمد یعقوب، مینیجر کسور پرنٹنگ پریس، گواہ نمبر دو شیخ محمد طفیل، گواہ نمبر چار مرزا محمد اسلم اور گواہ استغاثہ نمبر پانچ خدا بخش نے ان امور کے متعلق شہادت دی جن کا فحاشی سے کوئی تعلق نہیں۔ گواہ استغاثہ نمبر تین سید ضیاء الدین نے دوسرے امور پر بیان کرنے کے علاوہ اپنی رائے ظاہر کی کہ زیر بحث کہانی فحش ہے، تاہم ریکارڈ میں کوئی اس قسم کا مواد نہیں جن سے ظاہر ہو کہ یہ گواہ ماہر ادب سمجھا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں قانون شہادت کی دفعہ نمبر ۴۵ کی رو سے اس کی شہادت قابل قبول نہیں ہے۔ اس لیے جہاں تک فحاشی کے مسئلے کا تعلق ہے، استغاثے کا کیس جیسا کہ ابتدا پیش کیا گیا ہے، خود عدالت کی رائے اور الزام زدہ مواد کے مطالعہ کے بعد اس کی ماہیت پر منحصر ہو گیا۔

ملزمین نے صفائی میں سات گواہ ادبی امور کے ماہرین کی حیثیت سے پیش کیے۔ ان گواہوں کی شہادت سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ زیر بحث تحریر فحش نہیں ہے۔ صفائی کے اختتام پر استغاثے نے درخواست کی کہ مسئلے کی اہمیت کے پیش نظر کچھ اور ماہرین بطور عدالتی گواہ بلائے جائیں اور میں نے انصاف کی خاطر چار اور ماہروں کو بطور عدالتی گواہ بلوایا۔

بیشتر ماہرین نے خواہ وہ صفائی کی طرف سے پیش ہوئے یا عدالت کی طرف سے، کسی نہ کسی فریق کے حق میں رائے دی کہ زیر بحث کہانی فحش ہے یا نہیں ——— جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، تعزیرات میں فحاشی کی جو اصطلاح استعمال ہوئی ہے، اس کی ٹیکنیکل اہمیت ہے جس کا تعین عدالت کو کرنا ہے۔ ماہرین کی شہادت اسی حد تک ضروری ہے جہاں تک یہ ادب کی مروجہ معیاروں، اظہار کی شستگی، سوقیانہ پن، اخلاقی یا غیر اخلاقی حیثیت اور اس رجحان کے متعلق جو کوئی تحریر قارئین کے اذہان پر اثر انداز ہو، روشنی ڈالتی ہے۔

ان امور سے یہ تعین کرنا عدالت کا کام ہے کہ کوئی چیز "فحاشی" کی شرائط کو پورا کرتی ہے یا نہیں۔

صفائی کے گواہ نمبر ایک مسٹر عابد علی عابد، نمبر دو مسٹر احمد سعید، نمبر تین ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، نمبر چار ڈاکٹر سعید اللہ، نمبر پانچ فیض احمد فیض، نمبر چھ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم اور نمبر سات ڈاکٹر آئی۔ لطیف سب صاحب علم ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق، کیونکہ آرٹ زندگی کا آئینہ دار ہے، اس لیے فنکار کوئی ایسی چیز جو زندگی کی سچی تصویر ہو، حقیقت پسندانہ طور پر پیش کرنے سے اپنے حقوق سے تجاوز نہیں کرتا۔ اس لیے وہ یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ زندگی کا حقیقت پسندانہ اظہار فحش نہیں ہوسکتا۔ وہ زیرِ بحث کہانی کی غیر شائستہ زبان اور اس کے سوقیانہ محاوروں کو بھی قابلِ گرفت نہیں سمجھتے، کیونکہ یہ (محاورے) اس قسم کی گفتگو کی نمایندگی کرتے ہیں جو پیش کردہ کردار کی نوع کے لوگ بولتے ہیں ——— ان میں سے بعض (گواہوں) نے یہ کہا ہے کہ کہانی میں قارئین کے اخلاق کو بگاڑنے کا کوئی میلان نہیں پایا جاتا۔ بعض نے اس نکتے پر خاموشی اختیار کی ہے۔

عدالتی گواہ نمبر ایک مولانا تاجور، نمبر دو آغا شورش کاشمیری، نمبر تین مولانا ابو سعید بزمی اور نمبر چار ڈاکٹر تاثیر بھی اسی پائے کے علمی آدمی ہیں۔ ان گواہوں کی شہادت سے یہ بات نمایاں ہوتی ہے کہ زیرِ بحث کہانی بُرا ادب ہے اور غیر شائستگی سے پیش کی گئی ہے۔

صفائی کے گواہ نمبر سات ڈاکٹر آئی۔ لطیف نے رائے ظاہر کی کہ اگر زیرِ بحث کہانی کسی میڈیکل جریدے میں شایع ہوتی تو یہ ایک سبق آموز کیس ہسٹری ہوتی، لیکن ایک مقبولِ عام رسالے میں جسے ہر شخص پڑھ سکتا ہے، یہ ناموزوں معلوم ہوتی ہے۔

صفائی کے گواہ نمبر پانچ کرنل فیض احمد فیض کا خیال ہے کہ اگرچہ وہ اسے فحش نہیں کہہ سکتے، تاہم یہ کہانی ادب کا کوئی اچھا نمونہ نہیں ہے۔ اس میں بعض غیر شائستہ محاورے استعمال کیے گئے ہیں جن سے اجتناب کیا جاسکتا تھا۔

عدالتی گواہ نمبر ایک مولانا تاجور نے اس کی سخت اور غیر مبہم الفاظ میں مذمت کی اور کہا کہ انھوں نے اپنے چالیس سالہ ادبی تجربے میں اس سے زیادہ کوئی چیز غیر شائستہ نہیں دیکھی۔

عدالتی گواہ نمبر چار ڈاکٹر تاثیر کی رائے ہے کہ اس میں ان لوگوں کا اخلاق بگاڑنے کا رجحان موجود ہے جو شہوانی حرص کی طرف مائل ہوتے ہیں۔

پاکستان کے مروجہ اخلاقی معیار قرآن پاک کی تعلیم کے حوالے سے بہت صحیح طور پر معلوم ہوسکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ غیر شائستگی اور شہوانیت کی لگام شیطان کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ غیر شائستگی، شہوانیت، نفس پرستی اور سوقیانہ پن زندگی میں موجود ہے۔ اگر ادبی مذاق کے اس معیار کو تسلیم کرلیا جائے جسے صفائی کے گواہوں نے بیان کیا ہے تو زندگی کے پہلوؤں کا حقیقت نگارانہ اظہار اچھا ادب ہوسکتا ہے، لیکن پھر بھی ... ہمارے معاشرے کے اخلاقی معیار کی خلاف ورزی کرے گا۔

ط سعادت حسن منٹو کی لکھی ہوئی کہانی ایک سوقیانہ آدمی کے کردار کو پیش کرتی ہے جو اپنی معشوق ... بہت شہوت پرست ... دکھایا گیا ہے، وحشیانہ اور سوقیانہ انداز سے جنسی فعل کا طالب ہوتا ہے۔ جنسی تفصیلات ... ساتھ غیر

شائستہ گالیوں کا استعمال عام کیا گیا ہے۔ جنسی نوع کے افعال کے سلسلے میں نسوانی جسم کے بعض پوشیدہ اعضا کا ذکر نہایت بدتہذیبی سے کیا گیا ہے۔ ساری کہانی ایک ناشائستہ جنسی معاملے پر مرکوز ہے۔ درحقیقت جنسی بدتہذیبی ہی اس کہانی کا بنیادی تصوّر ہے۔

ادبی اور نفسیاتی ماہر کہانی کا ایک خاص انداز سے ردِعمل قبول کر سکتے ہیں، تاہم میری رائے میں ایک اَلھڑ نابالغ پر اس قسم کی کہانی کا ردِعمل، اظہار، بول چال اور خیالات میں غیر شائستگی کی حوصلہ افزائی کی صورت میں ہوگا۔

سعادت حسن منٹو جیسے بزعمِ خود مشہور مصنف کی مثال پیشِ نظر رکھتے ہوئے وہ نوجوان جو اس کہانی کو پڑھیں گے، اسی طرح سے غیر شائستگی کو تقویت دیں گے۔

کہانی بعنوان "ٹھنڈا گوشت" کو غور سے پڑھنے کے بعد مجھے اطمینان ہو گیا ہے کہ اس میں قارئین کا اخلاق بگاڑنے کا میلان موجود ہے اور یہ ہمارے ملک کے مروجہ اخلاقی معیاروں کی خلاف ورزی کرتی ہے۔ اس لیے میں ملزم سعادت حسن منٹو کو ایک فحش تحریر پیش کرنے کا ذمہ دار ٹھہراتا ہوں اور اسے زیرِ دفعہ ۲۹۲، پی۔ پی۔ سی تین ماہ قیدِ بامشقت اور تین سو روپے جرمانے کی سزا دیتا ہوں۔ عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں اس کو مزید اکیس یوم کی سزا بھگتنی پڑے گی۔

ملزمین عارف عبدالمتین اور نصیر انور جو واضح طور پر جریدے کے مدیر اور ناشر ہیں جس میں مذکورہ کہانی شایع ہوئی ہے، ایک فحش تصنیف کی اشاعتِ عام کے مجرم ہیں اور وہ بھی اسی دفعہ کے تحت آتے ہیں، تاہم ان کے معاملے میں ان کی کم عمری کے پیشِ نظر اور پھر یہ کہ کہانی کا مصنف ایک ایسا شخص تھا جو خاصی ادبی شہرت کا مالک ہے، انھوں نے اس اعتماد کی وجہ سے کہانی قبول کر لی ہو گی کہ یہ قابلِ قبول ادب پارہ ہے، میں ان ہر دو ملزموں کے لیے تین تین سو روپیہ جرمانے کی نرم سزا تجویز کرتا ہوں۔ چونکہ نصاف کے تقاضوں کو پورا کرے گی، اس لیے میں اس کے مطابق حکم دیتا ہوں۔ عدم ادائیگی جرمانہ کی ت میں ملزمین عارف عبدالمتین اور نصیر انور کو اکیس یوم قیدِ بامشقت بھگتنی پڑے گی۔

دستخط
اے۔ ایم۔ سعید
مجسٹریٹ درجہ اوّل
لاہور

۲۸ جنوری ۱۹۵۰ء کو سیشن میں اپیل دائر کر دی گئی ——— تاریخ ملنے پر ہم مہر الحق صاحب سیشن جج لاہور کی عدالت میں پیش ہوئے۔ آپ نے اِس بنا پر کہ وہ مجھے اور میرے خاندان کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں اور ہم شہر (امرتسر) کے ہیں، مقدمہ مسٹر جوشوا، اڈیشنل سیشن جج کی عدالت میں منتقل کر دیا۔

دوسری پیشی پر ہم حاضر ہوئے تو معلوم ہوا کہ مسٹر جوشوا نے کیس واپس مہر الحق صاحب کو بھیج دیا ہے، یہ عذر ظاہر کر کے کہ وہ اُردو زبان اچھی طرح نہیں جانتے۔

مہر الحق صاحب نے سوچ بچار کے بعد مقدمہ عنایت اللہ خاں صاحب، اڈیشنل سیشن جج کی عدالت کے سپرد کر دیا ——— ہم حاضر ہوئے تو عنایت اللہ خاں صاحب نے ہمارے وکیل سے فرمایا: "یہ کیس چونکہ میرے لیے اپنی نوعیت کا پہلا کیس ہے، اس لیے میں اچھی طرح اسٹڈی کرنا چاہتا ہوں اور اس کے لیے وقت درکار ہے . . . میں آپ کو ایک مہینے بعد کی تاریخ دیتا ہوں۔"

شیخ خورشید احمد نے کہا، ٹھیک ہے۔ چنانچہ دلائل کے لیے دس جولائی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔

شیخ خورشید احمد صاحب نے عدالت سے باہر آ کر مجھ سے کہا: "اچھا ہے، اس دوران میں بھی خوب تیاری کر لوں گا۔" لیکن انھوں نے اندیشہ ظاہر کیا کہ ہمارا کیس غلط آدمی کے پاس گیا ہے جو بڑا تنگ خیال ہے، داڑھی رکھتا ہے، نماز روزے کا پابند ہے۔

میں نے کہا: "ہٹائیے، یہاں نہیں تو ہائی کورٹ میں دیکھا جائے گا . . ."

شیخ خورشید صاحب نے اس دوران میں اپنی رہبری کے لیے مجھ سے کہا کہ میں اپنے افسانے "ٹھنڈا گوشت" پر ایک مختصر سا تبصرہ لکھ دوں، چنانچہ میں نے درج ذیل سطور لکھ کر اُن کے حوالے کر دیں:

تبصرہ

یوں تو کہانی بظاہر جنسی نفسیات کے ایک نکتے کے گرد گھومتی ہے، لیکن درحقیقت اس میں انسان کے نام ایک نہایت ہی لطیف پیغام دیا گیا ہے کہ وہ ظلم و تشدد اور بربریت و حیوانیت کی آخری حدود تک پہنچ کر بھی اپنی انسانیت نہیں کھوتا۔ اگر ایشر سنگھ اپنی انسانیت کھو چکا ہوتا تو مُردہ عورت کا احساس اس پر اتنی شدت سے کبھی اثر نہ کرتا کہ وہ اپنی مردانگی ہی سے عاری ہو جاتا۔

اتنے شدید قسم کے اثر کو نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے مناسب و موزوں اور قریب از حقیقت دکھانے کے لیے ضروری تھا کہ ایشر سنگھ کو جنسی لحاظ سے عام مردوں کے مقابلے میں زیادہ قوی بتایا جاتا، چنانچہ مصنف نے کہانی میں جگہ جگہ اپنے قلم کی جنبش سے بقدرِ کفایت ایسا کیا ہے۔

ایشر سنگھ کے کردار کے جنسی پہلو کو اور زیادہ اُجاگر کرنے اور اس طرح اس کے دردناک انجام کو قاری کے لیے قابلِ قبول بنانے کے لیے مصنف نے کلونت کور کا کردار پیش کیا ہے جو ایشر سنگھ ہی کی طرح عام عورتوں کے مقابلے میں جنسی لحاظ سے کہیں زیادہ قوی اور توانا ہے۔

اگر ایشر سنگھ ایک عام مرد ہوتا، اسی طرح اگر کلونت کور ایک عام عورت ہوتی تو یقینی طور پر افسانہ "ٹھنڈا گوشت" کا انجام کچھ اور ہی ہوتا۔ عام مرد پر جس کا جنسی تعلق ایک عام عورت سے رہا ہو، ایک لڑکی کی ٹھنڈی لاش ہرگز ہرگز وہ نفسیاتی اثر نہیں کر سکتی جو ایشر سنگھ نے اپنے قوی اور توانا جنسی کردار کے باعث محسوس کیا، اور اس شدت سے محسوس کیا کہ وہ اس کے نیچے دب کر، بلکہ پس کر اپنی مردانگی کھو بیٹھا۔

شہوت ایک جذبۂ آتشیں ہے۔ انسان میں اگر یہ جذبہ بیدار ہو تو اس کے جسم میں گرم رَو دوڑ جاتی ہے، اس کا درجۂ حرارت بڑھ جاتا ہے، اس کا دل و دماغ تپ جاتا ہے ——— زیرِ بحث افسانے کا عنوان "ٹھنڈا گوشت" ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عنوان جو کہ معنوی اعتبار ہی سے ٹھنڈا ہے، قاری کے دل و دماغ میں کسی قسم کی گرمی پیدا نہیں کر سکتا۔

اگر کوئی عورت جنسی لحاظ سے کمزور ہو تو ہم اُسے "ٹھنڈی عورت" کہتے ہیں، یعنی ایسی عورت جو مرد میں جنسی خواہش پیدا نہیں کرتی۔ افسانہ "ٹھنڈا گوشت" میں کلائمکس پیدا کرنے والی ایک لڑکی کی ٹھنڈی لاش ہے، ایسی ٹھنڈی لاش جو ایشر سنگھ جیسے پُرجوش شہوانی مرد کی ساری مردانگی پر برف کی سِل کی طرح گرتی ہے اور اُسے یخ بستہ کر دیتی ہے ——— ہم بخوبی سوچ سکتے ہیں کہ "ٹھنڈا گوشت" پڑھنے والے قارئین پر جو یقیناً ایشر سنگھ کی طرح پُرجوش شہوانی انسان نہیں ہو سکتے، اس کہانی کے انجام نے کس قسم کا اثر چھوڑا ہوگا ———

صفائی کے گواہ ڈاکٹر سعید اللہ ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی۔پی۔ایچ۔ڈی۔ڈی۔ایس۔سی نے اپنے تاثرات کو مختصر مگر جامع الفاظ میں کیا خوب بیان کیا ہے: افسانہ "ٹھنڈا گوشت" پڑھنے کے بعد میں خود ٹھنڈا گوشت بن گیا۔

جہاں تک نورمل انسانوں کا تعلق ہے، ہم بلا خوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ یہ افسانہ پڑھنے کے بعد ان کا ردِ عمل بعینہٖ ایسا ہی ہوگا۔ یہ جدا بات ہے کہ وہ ڈاکٹر سعید اللہ صاحب کی طرح اپنے محسوسات کو بطریقِ احسن بیان نہ کر سکیں۔

ایبنورمل انسانوں کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ ایسے لوگ موجود ہیں جو لاشوں سے بھی مباشرت کر سکتے ہیں۔

"ٹھنڈا گوشت" میں مرد اور عورت کے جنسی تعلقات کو کسی مقام پر بھی لذیذ انداز میں پیش نہیں کیا گیا۔ اوّلاً اس لیے کہ ایسا انداز افسانے کے مقصد سے متصادم تھا۔ ثانیاً اس لیے کہ افسانے کا مصنف "شہوت نگار" نہیں ہے۔ "ٹھنڈا گوشت" کوئی جوڑ دار آسن نہیں پیش کرتا، امساک کا نسخہ نہیں بتاتا، کسی خفیہ تصویر کی جھلک نہیں دکھاتا ——— "ٹھنڈا گوشت" ایک دردناک تصویر ہے۔ ایک ایسے مرد کی جس میں انسانیت کی رمق، اُس کے کردار کی تمام ہولناکیوں کے باوجود باقی تھی۔ اس رمق نے گو اُسے انجام کار نامرد بنا دیا اور وہ اپنے جنسی رفیق کے حسد کے باعث نہایت ہی تکلیف دہ موت سے ہمکنار ہوا لیکن یہ بات قابلِ غور ہے کہ مرتے ہوئے اسے اپنی موت کا احساس بالکل نہیں تھا، اس لیے کہ اُس کے دل و دماغ پر صرف ایک چیز مسلط تھی: ———
اُس لڑکی کی لاش کا برف ناک ردِ عمل جس کے ساتھ وہ مباشرت کرنا چاہتا تھا۔

مرنے سے پہلے ایشر سنگھ کو اپنی بہیمیت کا احساس بھی ہوا۔ اور یہ احساس اُس کے ارد گرد پھیلی ہوئی ظلمت میں روشنی کی ایک کرن تھی: لہو ایشر سنگھ کی زبان تک پہنچ گیا۔ جب اُس نے اُس کا ذائقہ چکھا تو اس کے بدن پر جھرجھری سی دوڑ گئی۔ اُس نے اپنے آپ سے کہا: "اور میں . . . اور میں . . . بھینی یا چھ آدمیوں کو قتل کر چکا ہوں . . .
اسی کرپان سے!"

ایشر سنگھ نے اپنی کرپان سے چھ آدمی قتل کیے تھے۔ جو نفسیاتی حادثہ اُسے پیش آیا، اُس سے پہلے غالباً اس نے کبھی غور نہ کیا ہوگا کہ اُس کے ہاتھوں چھ آدمیوں کا خون ہو چکا ہے۔ مگر اب وہ اپنے خون کا ذائقہ چکھتے ہوئے سوچتا ہے، بلکہ یوں کہیے کہ یہ سوچنے کے قابل ہو جاتا ہے کہ جس کرپان نے میرا گلا کاٹا ہے، اس سے میں چھ آدمی کاٹ چکا ہوں ——— جب وہ "چھ آدمیوں کو قتل کر چکا ہوں" کے ساتھ بھینی یا استعمال کرتا ہے تو کیا ہمیں اس گالی میں اُس کی روح کی دردناک چیخ سنائی نہیں دیتی؟

"اور میں . . . اور میں . . . بھینی یا چھ آدمیوں کو قتل کر چکا ہوں . . .
اسی کرپان سے!"

یعنی: ایشر سنگھ، تو درد اور تکلیف محسوس کر رہا ہے . . . لیکن جانتا ہے تو کہ اسی کرپان سے تو نے چھ آدمی مارے ہیں . . .

ایشر سنگھ سے ہم اس کے خیالات و محسوسات کے خوش اسلوب بیان کی توقع نہیں کر سکتے۔ وہ ایک گنوار آدمی ہے لیکن اس نے اپنے خام انداز میں سب کچھ بیان کر دیا ہے اور یہ خام انداز اپنی جگہ پر مناسب و موزوں ہے۔

ایشر سنگھ کی قوتِ مردمی سلب ہو چکی تھی لیکن وہ اپنے اندر ایک نئی کروٹ محسوس کر رہا تھا —— اس کے مقابلے میں کلونت کور کے دل و دماغ پر صرف ایک خیال مسلط تھا، اُس عورت کا خیال جس نے اُس کے خیال کے مطابق اس کے شوہر ایشر سنگھ کو موہ لیا تھا۔ وہ پوچھتی ہے: کون ہے وہ حرامزادی؟

ایشر سنگھ کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں۔ ایک ہلکی سی چمک اُن میں پیدا ہوئی اور اُس نے کلونت کور سے کہا: "گالی نہ دے اُس بھڑوی کو . . ."

اِن چھ الفاظ میں کیا مصنف نے ایشر سنگھ کے سارے جذبات جمع نہیں کر دیے۔ وہ کلونت کور کو منع کرتا ہے کہ وہ اس عورت کو گالی نہ دے لیکن خود اُسے "بھڑوی" کہتا ہے۔ دراصل گالی کا رُخ اس کی اپنی ذات کی طرف ہے۔ وہ بظاہر تو رحم اس عورت پر کھاتا ہے جس کو کلونت کور "حرامزادی" کہتی ہے لیکن درحقیقت اس کو رحم اپنی حالت پر آتا ہے۔

ذرا آگے چلیے تو سارا مطلب واضح ہو جاتا ہے۔

کلونت کور چلائی: "میں پوچھتی ہوں، وہ کون ہے؟"

ایشر سنگھ کے گلے میں آواز رندھ گئی: "بتاتا ہوں" یہ کہہ کر اُس نے اپنی گردن پر ہاتھ پھیرا اور اُس پر اپنا جیتا جیتا خون دیکھ کر مسکرایا: "انسان ماں یا بھی ایک عجیب چیز ہے۔"

یہاں ہم ایشر سنگھ کو ایک فلسفی، ایک خام فلسفی کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور اس خام فلسفی کے عقب میں ہمیں صرف ایک چیز نظر آتی ہے: اس لڑکی کی ٹھنڈی لاش جس سے ایشر سنگھ جیسا گرم مرد مباشرت کرنا چاہتا ہے۔

وہ مسکراتا ہے، صرف مسکرانے کے لیے نہیں۔ اُس کی مسکراہٹ دراصل اس کی حیرت کا مظہر ہے۔ چونکہ وہ سمجھ نہیں سکتا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے، اس لیے وہ مسکرا دیتا ہے اور اپنے مضطرب ذہن سے فرار حاصل کرنے کے لیے خود سے کہتا ہے: انسان ماں یا بھی ایک عجیب چیز ہے۔

یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے جو کسی انسان کے ساتھ پیش آ سکتا ہے۔

اس کو شہوانی جذبات کی برانگیختگی سے کیوں کر منسوب کیا جا سکتا ہے؟ کہانی جس میں ایک قوی اور توانا مرد کی شہوت سرد ہو جاتی ہے، پڑھنے والوں کے سفلی جذبات کیسے مشتعل کر سکتی ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ "ٹھنڈا گوشت" میں چند ایسے الفاظ اور فقرے موجود ہیں جن کو اگر افسانے کے جسم سے نوچ کر، علیحدہ کر کے دیکھا جائے تو وہ ناشائستہ اور غیر مہذب معلوم ہوں گے، مگر وہ افسانے کا لازمی جزو ہیں جن کے بغیر افسانہ مکمل نہیں ہو سکتا۔ کسی لفظ کو یا کسی فقرے کو اُس کے گرد کے ماحول کے ساتھ ہی دیکھنا پڑتا ہے۔

اگر آپ "جگ ساپزل" میں سے ایک ٹکڑے کو اٹھالیں اور کہیں: "یہ تو گدھے کی دم ہے۔" تو ظاہر ہے کہ

آپ اپنی رائے صحیح طور پر قائم نہیں کر رہے ہیں، اس لیے کہ اس ٹکڑے کو اس کے صحیح مقام پر رکھ کر "جگ ساپزل" کو من حیث المجموع دیکھنا پڑے گا، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ ٹکڑا دوسرے ٹکڑوں کے ساتھ جڑ کر کسی خوبصورت عورت کے گلے میں پڑی ہوئی لومڑی کی کھال کی شکل اختیار کر جائے۔

اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ جو ناشائستہ اور غیر مہذب الفاظ یا فقرے ہیں وہ کس قسم کے انسان کے منہ سے نکلے ہیں۔ ایشر سنگھ ایک گنوار اور غیر مہذب انسان ہے، اس کے منہ سے ہم شائستہ اور مہذب گفتگو کی توقع نہیں کر سکتے۔

اب ہم گالیوں کی طرف آتے ہیں جو ایشر سنگھ کے مکالموں میں ہمیں نظر آتی ہیں۔

ہم اس حقیقت سے کبھی اغماض نہیں کر سکتے کہ اکثر مہذب اور غیر مہذب انسان (مرد اور عورتیں) اپنے روزمرہ کی گفتگو میں گالیاں استعمال کرتے ہیں۔ ایشر سنگھ اپنی گفتگو میں گالیاں بغیر کسی تکلف کے استعمال کرتا ہے۔ اس لیے کہ اس کا مقصد گالی دینا نہیں۔ اکثر مقامات پر وہ گالی کو بطور تکیہ کلام کے استعمال کرتا ہے۔

"ادھر میں . . . ادھر میں . . . بھینی یا چھ آدمیوں کو قتل کر چکا ہوں۔"

ظاہر ہے کہ گالی کا رخ نہ تو خود ایشر سنگھ کی طرف ہے نہ ان چھ آدمیوں کی طرف جنھیں وہ قتل کر چکا ہے۔

"گلا چرا ہوا ہے ماں یا میرا۔"

ظاہر ہے کہ "گلے" کی کوئی ماں نہیں ہے جس کو وہ گالی دے رہا ہے۔

"یہ کڑی یا دماغ ہی خراب ہے۔"

اس کے متعلق بھی ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ دماغ کی کوئی بیٹی نہیں ہے جس کو وہ گالی دے رہا ہے۔

اسی طرح کلونت کور ایک جگہ کہتی ہے: "یہ بھی کوئی ماں یا جواب ہے؟"

دو مقامات پر ایشر سنگھ کہتا ہے: "انسان ماں یا بھی عجیب چیز ہے . . ." —— "انسان کڑی یا بھی عجیب چیز ہے!" جیسا کہ صفائی کے گواہ مسٹر آئی۔ لطیف نے کہا ہے یہ گالیاں اپنی جگہ بہت نفسیاتی اہمیت رکھتی ہیں۔ افسانے کو غور سے پڑھنے کے بعد قاری سمجھ سکتا ہے کہ ان گالیوں میں ایشر سنگھ کے مضطرب اور متجسس دل و دماغ کی کرب انگیز کیفیت جھلکیاں لیتی ہے۔ وہ اپنی حالت کا صحیح جائزہ لینا چاہتا ہے لیکن ناکام رہتا ہے اور آخر کار ان الفاظ میں فرار حاصل کرتا ہے: "انسان ماں یا بھی عجیب چیز ہے . . . انسان کڑی یا بھی عجیب چیز ہے . . . !!

دس جولائی کا دن گرجتا ہوا آن پہنچا!

مجھے سخت تشویش لاحق تھی۔ گھر میں سب دعائیں مانگ رہے تھے کہ خدا خیر کرے۔

جج صاحب نے خاص کیس سمجھتے ہوئے چار گھنٹے بحث کے لیے وقف کر رکھے تھے ——— مجھے ڈر تھا کہ میاں اے۔ ایم۔ سعید کی طرح کہیں عنایت اللہ خاں صاحب کا رویّہ بھی مخاصمانہ نہ ہو کیونکہ ضبط کرنا میرے لیے بہت مشکل تھا۔ میاں سعید صاحب کی عدالت میں کئی دفعہ ایسے موقعے آئے تھے کہ میں چھلک پڑتا مگر حیرت ہے، میں نے کیسے ضبط کیا۔

ہم سب صبح حاضرِ عدالت ہوئے تو عنایت اللہ خاں صاحب نے اپنے دھیمے لہجے میں شیخ خورشید صاحب سے کہا: "معاف کیجیے، آپ کو آدھا گھنٹہ انتظار کرنا پڑے گا۔ میں ذرا یہ چھوٹے چھوٹے معاملے طے کر لوں۔"

ہم عدالت سے باہر نکل آئے ——— عارف عبدالمتین خاموش تھا۔ شیخ خورشید صاحب بھی خاموش تھے۔ اپنے ساتھ وہ موٹی موٹی قانونی کتابوں کا ایک ڈھیر اٹھا کے لائے ہوئے تھے۔ اُن کا دماغ شاید ان کے حوالوں میں گم تھا۔ میں ہائی کورٹ کی سوچ رہا تھا۔ نصیر انور چودھری گھاس پر رومال بچھا کر بیٹھا ہوا غالباً کوئی کشمیری گیت گا رہا تھا۔

پونے گھنٹے کے بعد ہمیں بلایا گیا ——— ہم عدالت کے کمرے میں داخل ہوئے اور ہم نے جج صاحب کو سلام کیا۔

عنایت اللہ خاں صاحب نے گردن کی ایک ہلکی سی جنبش سے اس کا جواب دیا۔

ہم ملزموں کے کٹہرے کی طرف بڑھنے لگے تو آپ نے اپنی دھیمی آواز میں کہا: "کرسیوں پر تشریف رکھیے۔"

میں سمجھا کہ شاید یہ کسی اور سے کہا گیا ہے مگر اُن کا روئے سخن ہماری طرف ہی تھا۔ مجھے بڑا خوشگوار تعجب ہوا ——— ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ نصیر انور کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ بے حد مطمئن نظر آتا تھا۔

پیشتر اس کے کہ بحث شروع ہوتی جج صاحب بولے: "میں نے اس کیس کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ آپ حضرات مطمئن رہیں، کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ میں نے مسل میں سے صرف عدالتِ ماتحت کا فیصلہ پڑھا ہے۔ گواہیوں کا میں نے مطالعہ کرنا غیر ضروری سمجھا ہے، البتہ افسانہ 'ٹھنڈا گوشت' بہت غور سے پڑھا ہے۔"

بحث شروع ہونے والی تھی کہ عنایت اللہ خاں صاحب نے استغاثے اور صفائی کے وکیلوں کی توجہ چند نکات کی طرف دلائی اور وضاحت چاہی۔ شیخ خورشید احمد خاموش رہے، ایک دو مرتبہ جج صاحب کی تائید میں البتہ کچھ ضرور کہا۔ پروسی کیوٹر صاحب کی تردید خود خاں صاحب کر رہے تھے۔

قریباً آدھا گھنٹہ قانونی موشگافیاں کرنے کے بعد آپ نے مسکرا کر کہا: "میں سعادت حسن منٹو کو اگر سزا دوں تو وہ یہ کہیں گے، ایک داڑھی والے نے مجھے سزا دی..."

اس کے بعد وہ کچھ دیر اور عدالتِ ماتحت کے فیصلے پر کچھ کہتے رہے۔ آخر میں ہم سے مخاطب ہوئے:
"کیا آپ لوگوں نے جرمانہ ادا کر دیا تھا؟"
ہم سب نے کہا: "جی ہاں۔"
اس پر جج صاحب نے کہا: "آپ بری ہیں۔ جرمانہ آپ کو پورے کا پورا واپس مل جائے گا۔"
میں چند لمحات کچھ سوچ نہ سکا کہ کیا ہوا ہے۔ شیخ خورشید صاحب نے میرا شانہ پکڑ کر ہلایا اور کہا: "اُٹھیے حضرت آپ بری ہیں . . ."
عدالت سے باہر نکل کر جب میں نے چپڑاسیوں کو دس روپے انعام کے طور پر دیے تو مجھے احساس ہوا کہ میں واقعی بری ہوں اور یہ کہ چوتھی مرتبہ میرا انجام بخیر و خوبی ہوا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا جس نے ایک بہت بڑی لعنت سے مجھے رہائی دلائی۔
شیخ خورشید صاحب اپنی کامیابی پر بہت خوش تھے اور بجا خوش تھے۔

عنایت اللہ خاں صاحب کے انگریزی زبان میں لکھے ہوئے فیصلے کا اُردو ترجمہ یہ ہے:

اپیل بخلاف حکم مسٹر اے۔ ایم۔ سعید
مجسٹریٹ درجہ اوّل، لاہور

مورخہ ۱۶ جنوری، ۱۹۵۰ء

○

دعویٰ زیر دفعہ ۲۹۲ پی۔ پی۔ سی

○

سزا

عارف عبدالمتین: تین سو روپیہ جرمانہ، بصورت عدم ادائیگی تین ہفتے قیدِ بامشقت۔

سعادت حسن منٹو: تین ماہ قیدِ بامشقت اور تین سو روپیہ جرمانہ، بصورت عدم ادائیگی اکیس یوم قیدِ بامشقت۔

نصیر انور: تین سو روپیہ جرمانہ، بصورت عدم ادائیگی تین ہفتے قیدِ بامشقت۔

○

فیصلہ

○

تین نوجوانوں، عارف عبدالمتین، نصیر انور اور سعادت حسن منٹو کی طرف سے یہ ایک اپیل ہے۔ اوّل الذکر دونوں ایک اُردو رسالہ "جاوید" کے علی الترتیب مدیر اور ناشر ہیں۔ تیسرا ایک ادیب ہے جس نے مذکورہ رسالے کے مارچ ۱۹۴۹ء میں شایع شدہ ایک خاص نمبر میں اپنی ایک کہانی جس کا نام "ٹھنڈا گوشت" ہے، چھپنے کے لیے دی۔

انھیں بحکم میاں اے۔ ایم۔ سعید، مجسٹریٹ درجہ اوّل، لاہور مورخہ ۱۶ جنوری ۱۹۵۰ء، زیر دفعہ ۲۹۲ پی۔ پی۔ سی (فحش کتابوں کی فروخت وغیرہ) کی خلاف ورزی کے سلسلے میں مجرم قرار دیا گیا ہے۔ مصنف مسٹر منٹو کو تین ماہ قید بامشقت اور تین سو روپیہ جرمانہ، بصورت عدم ادائیگی جرمانہ اکیس یوم مزید قید بامشقت کی سزا دی

گئی ہے۔ دوسرے دونوں یعنی مدیر اور ناشر کو صرف تین تین سو روپیہ جرمانہ، بصورت عدم ادائیگی تین تین ہفتہ قید با مشقت کی سزا دی گئی ہے۔

یہ تینوں اپیل میں پیش ہوئے ہیں۔

واقعات فیصلہ زیر اپیل موجود ہیں۔

مضمون کی طرف حکومت کی توجہ پریس برانچ کے ایک عہدے دار نے مبذول کرائی تھی اور چیف سیکرٹری نے قانونی چارہ جوئی کا حکم دیا تھا۔

میں نے فریقین کے فاضل مشیرانِ قانون کو سنا ہے اور مثل کا مطالعہ کیا ہے ——— میرا خیال ہے کہ ملزمین کے خلاف جرم ثابت نہیں کیا جا سکا، اس لیے سزا برقرار نہیں رہ سکتی۔ میرا خیال ہے کہ مضمون زیرِ بحث کو فحش اور خاص طور پر خلافِ قانون قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ملزمین رسالے سے اپنا تعلق مانتے ہیں۔ اب طے کرنے کے لیے فقط ایک سوال ہے کہ کہانی فحش اور خصوصاً خلافِ قانون ہے یا کہ نہیں۔ اس سلسلے میں کئی نکتے پیدا ہوتے ہیں، اوّلاً یہ کہ لفظ "فحش" سے ہم کیا مراد لیتے ہیں۔ دوم یہ کہ یہ ایسا معاملہ ہے جس میں ماہرین کی شہادت پیش کی جا سکتی ہے۔ سوم یہ کہ آیا مضمون زیرِ بحث قابلِ اطلاق معیاروں کے مطابق فحش قرار دیا جا سکتا ہے؟

میں نے قانونِ جرائم ایڈیشن ۱۹۴۵ء میں رتن لال وغیرہ کی کومنٹری دیکھی ہے اور وہاں اٹھائے ہوئے سوالوں پر فریقین کے پیش کردہ دلائل پر غور کیا ہے ——— فحاشی کی جانچ کا معیار وہاں یہ مقرر کیا گیا ہے:

آیا فحاشی کے تحت الزام زدہ مضمون میں ان لوگوں کے اخلاق بگاڑنے اور ان کو بدی کی ترغیب دینے کا میلان ہے جن کے ذہن ایسے غیر اخلاقی اثرات قبول کرنے کے لیے تیار ہیں، اور جن کے ہاتھوں میں اس قسم کی اخلاق کے لیے ضرر رساں تصنیف ہے، آنے اتفاق کیا جائے، ان کے ذہن میں بد چلنی اور بدکاری کا اثر پیدا کرے گی، (اگر ایسا ہے) تو یہ ایک فحش اشاعت ہوگی۔ قانون کا منشا ہے کہ اس (کی فروخت) کو روکا جائے۔ اگر کوئی تحریر حقیقتاً کسی ایک بھی جنس کے نوجوانوں یا زیادہ عمر کے لوگوں کے اذہان کو انتہائی گندے اور شہوت پرستانہ قسم کے خیالات سمجھائے تو اس کی اشاعت خلافِ قانون ہے، خواہ ملزم کے پیشِ نظر کوئی در پردہ مقصد ہی کیوں نہ ہو جو معصوم حتیٰ کہ قابلِ تعریف ہو۔ کوئی چیز جو شہوانی جذبات کو مشتعل کردے، فحش ہے۔

پھر ایسے فیصلے بھی ہیں جو قرار دیتے ہیں کہ محض فقروں اور جملوں کو اس لیے معاف نہیں کیا جا سکتا کہ باقی کی اشاعت ناقابلِ اعتراض ہے، اور کہ یہ کوئی جواز نہیں کہ شایع شدہ مضمون کسی ممتاز مصنف کا لکھا ہوا ہے یا ایسے اسلوب میں لکھا گیا ہے جو آسانی سے ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آسکتا یا یہ کہ اشاعت میڈیکل ہے اور صرف مخصوص گاہکوں کے پاس بھیجی جاتی ہے ——— ہمیں نہ صرف تصنیف کی ماہیت کو بلکہ حاضر معاشرہ کی حالت کو بھی دیکھنا ہے۔ اگر تصنیف بازار میں آزادانہ مہیا ہو سکتی ہے تو

ہمیں یہ طے نہیں کرنا کہ مخصوص یا خواہش سے خریدنے والے گاہک اور پڑھنے والے کون ہیں۔ ہمیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ آیا یہ عوام تک پہنچ سکتی ہے جن میں دونوں جنس کے جواں سال اور بڑی عمر کے لوگ بھی شامل ہیں —— پس ہمیں تصنیف کی ماہیت کا اپنے سماج کی موجودہ حالت کی روشنی میں تعین کرنا ہے۔

میرے خیال میں اس معاملے کو اس مقام پر چھوڑا جا سکتا ہے اور ہمیں اس کی طرف بعد میں رجوع کرنا چاہیے، جب ہم اس مسئلے پر غور کر چکیں کہ آیا یہ سوال ماہروں کی رائے سے طے ہو سکتا ہے یا نہیں —— جہاں تک اس امر کا تعلق ہے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ معاملہ ماہروں کی رائے سے ہرگز طے پانے والا نہیں۔ ہمیں اس پر غور نہیں کرنا کہ اس کے متعلق کچھ خاص اور ممتاز ادیب کیا رائے قائم کرتے ہیں، اس کے برخلاف ہمیں یہ پڑتال کرنا ہے کہ پڑھنے والوں پر عام طور سے تحریر و تصنیف کا کیا ردِ عمل ہوگا۔ اگر میرا یہ خیال درست ہے تو فاضل عدالتِ ماتحت کی ریکارڈ کردہ شہادتوں کا کوئی حصہ اس نکتے کے لحاظ سے قابلِ قبول نہیں رہ سکتا۔ اگر ہم ان حضرات کی شہادت کو جو فریقین یا عدالت کی طرح سے پیش ہوئے، عام پڑھنے والوں کی شہادت کی حیثیت سے قبول کریں اور کسی ایک فریق کو خاص اہمیت نہ دیں تو ریکارڈ شدہ شہادت عدالت کو کوئی زیادہ مدد نہیں دیتی۔ گواہوں کی ایک جماعت نے یہ کہا ہے کہ زیرِ بحث مضمون انتہائی فحش ہے۔ دوسری جماعت نے اس کے خلاف بیان دیا ہے اور اسے ایک ایسا فن پارہ قرار دیا ہے جس میں کوئی بھی غیر اخلاقی چیز نہیں —— غور کرنے پر یہ پتہ چل سکتا ہے کہ یہ رائے عین قدرتی فرق ہے۔ مختلف طبقوں کے پڑھنے والوں کا ردِ عمل مختلف ہوتا ہے۔ جب تک ہم جانچ کا ایک معیار مقرر نہ کریں جس کو پیشِ نظر رکھا جائے، اتفاقِ رائے پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ مختلف مزاجوں، عمروں، پیشوں اور مختلف قسم کی تعلیم حاصل کیے ہوئے لوگوں کا ردِ عمل بھی ضرور مختلف ہوگا، اور علاوہ اس کے کہ یہ طے ہے، اخلاق ایک اضافی اصطلاح ہے، فحاشی کے سوال پر نظریات ضرور ایک دوسرے سے مختلف اور بہت نمایاں حد تک مختلف ہوں گے —— (اس لیے) میری رائے میں صحیح بات یہ ہے کہ اس مسئلے کو اس "افسانوی آدمی"، (یعنی) "پبلک کے ایک عام رکن" کے نقطۂ نظر سے جانچنا چاہیے۔

یہ طے کر چکنے کے بعد ہمیں یہ دیکھنے کے لیے زیرِ بحث مضمون پر غور کرنا ہے کہ یہ ہمارے سماج کے مسلّمہ اخلاقی نظریات کے خلاف کہاں تک جاتا ہے —— اس موقعہ پر مجھے زیرِ اپیل فیصلے کے ایک غلط مفروضے اور گمراہ کرنے والی دلیل کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ فاضل مجسٹریٹ نے اس بیان سے ابتدا کی ہے کہ فحاشی کی اصطلاح اس ماحول کے ساتھ متعلق ہے جس میں اس کے متعلق فیصلہ کیا جاتا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ مختلف قوموں اور سوسائٹیوں کے معیار مختلف ہو سکتے ہیں —— یہاں تک وہ درست تھا۔ اس نے غلطی وہاں کی جب اس نے یہ سمجھا کہ پاکستان کے مروجہ اخلاقی معیار قرآن پاک کی تعلیم کے سوا اور کہیں سے زیادہ صحیح طریقے پر معلوم نہیں ہو سکتے۔ پھر وہ یہ کہتا ہے کہ "غیر شائستگی اور شہوت پرستی شیطان کی طرف سے ہے" —— اس میں شک نہیں کہ یہ ہمارا آدرش ہے (قرآن پاک کی تعلیم کے مطابق اخلاقی معیاروں کی تشکیل) لیکن سوال یہ نہیں ہے، بلکہ سوال یہ ہے کہ (آج) ہمارے سماج کی اصلی حالت کیا ہے۔ جیسا کہ ظاہر ہے، ہم نے اپنا نصب العین ابھی تک حاصل نہیں کیا ہے —— (تو) اپیل کرنے والوں کو اس کے مطابق جانچنا چاہیے جس طرح کہ ہماری سوسائٹی ہے، نہ کہ اس طرح جیسا کہ اسے ہونا چاہیے۔

جب ہم سوچتے ہیں کہ کیسی کیسی مطبوعات مارکیٹ میں موجود ہیں جن پر کوئی احتساب قائم نہیں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ زیرِ بحث مضمون کہیں کم قابلِ اعتراض ہے ——— متعدد "اسراری" مطبوعات کی اشاعت کے خلاف کوئی پابندی نہیں جن سے زیادہ اور کوئی چیز فحش نہیں ہو سکتی۔ سنیماؤں میں "تماشاؤں" کی نمائش پر کوئی احتساب نہیں جو زیرِ بحث مضمون سے کچھ کم قابلِ اعتراض نہیں ہوتے ——— اگر ہمیں مغربی تہذیب کو اپنانا اور اس کو پسند کرنا ہے جیسا کہ ہم کر رہے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ ہم ایسی تحریر جیسی کہ ہمارے سامنے موجود ہے، معقول طور پر فحاشی کا اعتراض نہیں کر سکتے۔ یہ تو اس تہذیب کا لازمی نتیجہ ہے اور حسبِ معمول اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ——— چوما چاٹی اور بغل گیری ایک ایسی چیز ہے جو ہر روز سنیماؤں میں پیش کی جاتی ہے۔ بدکاری وہ عام اور بنیادی زمین ہے جس پر "سچی کہانیاں" اور دائمی مثلثیں استوار کی جاتی ہیں۔ درحقیقت یہی تمام انگریزی اور مغربی ناولوں کا بنیادی پلاٹ ہے۔ اگر ان پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاتا تو مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ہم کیوں ان نوجوانوں پر سختی کریں۔

زیرِ بحث کہانی رسالے کے صفحہ ۸۸ سے لے کر صفحہ ۹۲ تک چھپی ہے ——— قصہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ ایک خاص شخص جس کا نام ایشر سنگھ تھا، کا ایک خاص عورت کلونت کور کے ساتھ ناجائز تعلق تھا۔ اس نے فسادات کے دوران ایک مکان میں چھ آدمیوں کو قتل کیا تھا اور ایک خوبصورت لڑکی کو وہ وہاں سے اٹھا لایا تھا۔ اس نے اس لڑکی کے ساتھ زنا بالجبر کرنے کی کوشش کی لیکن اسے پتا چلا کہ لڑکی مر چکی ہے۔ وہ تو ٹھنڈا گوشت ہے۔ اس کہانی کے مطابق اس انکشاف نے ایشر سنگھ پر ایسا اثر کیا اور اس کے شہوانی جذبات کو اتنا سُن کر دیا کہ جب وہ بعد میں کلونت کور کے پاس گیا تو وہ اس قابل نہیں رہا تھا کہ اس کے ساتھ سو سکے، حالانکہ اس نے اس مقصد کے لیے (کلونت کور کے ساتھ سونے کے لیے) ابتدائی قدم اٹھائے تھے ——— اس (افسانے) میں یہاں وہاں کچھ ناشائستہ اصطلاحیں اور کچھ قابلِ اعتراض الفاظ موجود ہیں اور کچھ سوقیانہ گالیاں بھی، بالکل اسی قسم کی جو ہماری سوسائٹی کے نچلے طبقے میں عام ہیں۔

اب کسی مضمون کی ماہیت پر غور کرنے کے لیے آدمی کو کئی اصطلاحات اور تصریحات کو زیرِ نظر رکھنا پڑے گا، مثلاً چند ایک کا نام لیں تو ایک مضمون "باذوق" یا "بدذوق"، "غیر مناسب" یا "سوقیانہ" "ناشائستہ" یا "فحش" ہو سکتا ہے۔ اتنے تدریجی رنگوں کے امتزاج کو ایک دوسرے سے الگ ہٹا کر اس مضمون کو جسے فحش قرار دیا جانا ہو قطعی طور پر "غیر شائستہ"، "غیر اخلاقی"، "ضرر رساں" اور "بہت کچھ اور" ہونا چاہیے، لیکن زیادہ سے زیادہ میں اس مضمون کے متعلق کہوں گا تو وہ یہ ہے کہ یہ سوقیانہ اور ناشائستہ ہے۔

فاضل پی۔ پی۔ ایس نے کسی ایسے خاص قابلِ اعتراض پیروں کی طرف اشارہ نہیں کیا ہے جس کو وہ یقینی طور پر "فحش" قرار دیتا ہے ——— کسی شخص نے کہانی کی چند سطروں پر نشان لگائے ہیں لیکن وہ ایسی ہیں جن کے متعلق میں پیشتر ذکر کر چکا ہوں اور ان کو دوبارہ پیش کرنے سے کوئی مفید مقصد حاصل نہیں ہو گا۔ مجھے اس لیے فاضل عدالتِ ماتحت سے اختلاف ہے۔ میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ مجھے اس مضمون سے اتفاق ہے لیکن میں اسے "فحش" یا زیادہ قابلِ اعتراض نہیں سمجھتا۔

——— چنانچہ میں اپیل منظور کرتا ہوں اور تینوں اپیل کرنے والوں کو بری کرتا ہوں۔ وہ پہلے ہی ضمانت پر ہیں۔ جرمانہ اگر ادا کر دیا گیا ہے تو وہ سارے کا سارا واپس دے دیا جائے۔

ایک لطیفہ سنیے۔

گیارہ جولائی کی صبح کو نذیر احمد چودھری، مالک "نیا ادارہ" اور مدیر "سویرا" جو دوسرے ترقی پسندوں کے ساتھ مل کر مجھے رجعت پسند قرار دے چکے ہیں اور حلف اُٹھا چکے ہیں کہ میری کوئی تحریر اپنے "سویرا" میں شایع نہیں کریں گے، تشریف لائے۔ انھوں نے بغل گیر ہو کر بڑی گرمجوشی سے مبارکباد دی اور کہا: "منٹو صاحب، اب 'ٹھنڈا گوشت' عنایت فرما دیجیے کہ میں 'نمرود کی خدائی' میں شامل کرلوں۔ ۔ ۔"

میں چودھری صاحب کی اس درخواست پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا۔

چند دن ہوئے، کوہاٹ سے ایک صاحب، آفیسر کیڈٹ مظہر علی کا خط موصول ہوا:

مجھے امید ہے، آپ کو یاد ہوگا کہ میں کون ہوں۔ ریاض صاحب کی دکان پر آپ سے چند ملاقاتوں ہی نے مجھے آپ کا گرویدہ بنا دیا تھا ——— بہت دن ہوئے، میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ آپ کو "ٹھنڈا گوشت" سے نجات مل گئی ہے۔ فرصت کم ہونے کے باعث آپ کو مبارک باد کا خط نہ لکھ سکا۔ اب گو مبارک باد بہت دیر سے ہے لیکن پھر بھی آپ قبول فرمائیں۔ مجھے پکا یقین ہے کہ ایسی مخالفتوں کے باوجود آپ کے مداح بڑھتے جائیں گے۔

سُنا ہے، چودھری محمد حسین صاحب جو آپ کے ساتھ اکثر نوک جھونک کرتے رہتے تھے، اس دنیا ہی سے چل بسے۔ اب تو معاملہ کچھ بے مزہ سا ہوگیا۔ لیکن دنیا میں سرپھروں کی کمی نہیں۔ کوئی اور صاحب ان کی جگہ ضرور سنبھال لیں گے۔

مجھے چودھری محمد حسین صاحب کی وفات کا بہت افسوس ہے۔ خدا ان کو غریق رحمت کرے۔ اب کہ وہ اس دُنیا میں نہیں ہیں، مَیں ان کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتا ——— ان کی جگہ اگر کوئی دوسرا سنبھال لے گا تو مَیں کہوں گا: سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی۔

لاہور

۲۰ اگست، ۱۹۵۰ء

سعادت حسن منٹو

تعطّل

ٹھنڈا گوشت کا مقدمہ قریب قریب ایک سال چلا۔ ماتحت عدالت نے مجھے تین ماہ قید با مشقت اور تین سو روپے جرمانے کی سزا دی۔ سیشن میں اپیل کی تو بری ہو گیا (اس حکم کے خلاف سرکار نے ہائی کورٹ میں اپیل دائر کر رکھی ہے؛ مقدمے کی سماعت ابھی تک نہیں ہوئی)۔

اس دوران میں مجھ پر جو گزری، اس کا کچھ حال آپ کو میری کتاب ٹھنڈا گوشت کے دیباچے بہ عنوان زحمتِ مہرِ درخشاں میں مل سکتا ہے۔

دماغ کی کچھ عجیب ہی کیفیت تھی؛ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ لکھنا چھوڑ دوں یا احتساب سے قطعاً بے پروا ہو کر قلم زنی کرتا رہوں ——— سچ پوچھیے تو طبیعت اس قدر کھٹی ہو گئی تھی کہ جی چاہتا تھا، کوئی جیز الاٹ ہو جائے تو آرام سے کسی کونے میں بیٹھ کر چند برس قلم اور دوات سے دُور رہوں؛ دماغ میں خیالات پیدا ہوں تو انھیں پھانسی کے تختے پر لٹکا دوں؛ الاٹمنٹ میسر نہ ہو تو بلیک مارکیٹنگ شروع کر دوں یا ناجائز طور پر شراب کشید کرنے لگوں . . .

لاہور

۱۱ر جنوری، ۱۹۵۲ء

سعادت حسن منٹو

ہائی کورٹ ججمنٹ

P L D 1952 Lahore 384

Before Muhammad Munir, C. J. and Muhammad Jan, J

CROWN—Appellant
versus
SAADAT HASSAN MINTO and two others—
Accused-Respondents

Crown's Appeal No. 584 of 1950, decided on 8th April, 1952, from the order of Inayat Ullah Khan, Additional Sessions Judge, Lahore, dated the 10th July 1950, acquitting the accused-respondents.

Crown v. Saadat Hassan Minto — — Muhammad Munir, CJ and Muhammad Jan, J

Penal Code (XLV of 1860), S. 292— 'Obscene''—Definition— Outline of story innocuous yet details may be obscene— Obscenity to be determined with reference to standards current in society in which words are uttered or published—Intention of author—Whether material in determining obscenity.

ہوسکتا ہے کہ افسانے کا خاکہ قطعی طور پر بے ضرر ہو، اس کے باوجود وہ تفصیلات فحش ہو سکتی ہیں جن میں اظہار کے بعض استعمال شدہ پیرائے انتہائی بیہودہ ہوں، اور کچھ بھونڈے استعارے ہوں جو جنسی عمل کے ارتکاب کی جانب اشارہ کرتے ہوں۔

شائستگی اور فحاشی کی اصطلاحیں اضافی ہیں اور ایک معاشرے میں جو چیز فحش یا ناشائستہ ہے، ممکن ہے کہ دوسرے معاشرے میں وہی چیز بالکل شائستہ اور اخلاقی تصور کی جائے۔ اس سوال پر غور کرتے ہوئے، کہ آیا کچھ الفاظ اور اسالیب فحش ہیں یا نہیں، ہمیں اپنے معیاروں کا اطلاق کرنا ہوگا جو اس معاشرے میں مستعمل ہوں جہاں وہ الفاظ یا اسالیب ادا کیے گئے ہوں۔ اس ملک میں یا مہذب دنیا کے کسی بھی گوشے میں معاشرے کی موجودہ صورت حال کے پیش نظر، اس امر میں شبہے کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ مباشرت کی تیاری کے عمل کا بیان خواہ کتنا ہی درست اور حقیقت کے مطابق ہو، اسے بہرحال فحش سمجھا جائے گا۔

[p. 386] a

فحاشی کی یہ پہچان ہمیشہ قائم رہی ہے کہ کیا موردِ الزام امر میں ایسے ذہنوں کو بگاڑنے اور بداطواری کی جانب مائل کرنے کا میلان پایا جاتا ہے جو غیر اخلاقی اثرات کو قبول کر سکتے ہیں اور جن کے ہاتھوں میں اس نوع کی مطبوعات پہنچ سکتی ہیں، اور یہ کہ اس تصنیف کو شائع کرنے کا منشا یا ارادہ اسے فحش ہونے سے نہیں بچا سکتا اگر اس کی تفصیلات فی نفسہٖ فحش ہوں۔

[p. 386] *b*

وہ قابلِ اعتراض عبارت جو انتہائی مبتذل جنسی تفصیلات سے بھری پڑی ہے اور بلاشبہ دونوں صنفوں کے نوعمر ذہنوں، حتیٰ کہ معمر لوگوں کے ذہنوں میں بدکاری اور شہوت پرستی کے مذموم خیالات کی محرک ہو سکتی ہے، اُس عبارت کو فحش قرار دے دیا گیا ہے۔ یہ سوال یہاں قطعاً غیر اہم ہے کہ اس افسانے کی تصنیف میں مصنف کا منشا کیا تھا۔

[p. 387] c

Reg v. *Hicklin* 1868 L R 3 Q B 360 *rel.*
Kailashchandra Acharjya v. *Emperor* I L R 60 Cal. 201 *ref.*
Abdul Aziz Khan, Advocate-General for Appellant (Crown).
Abdur Rahman for Respondents.

JUDGMENT

Muhammad Munir, CJ

محمد منیر، چیف جسٹس : معاملہ زیرِ سماعت، تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ ۲۹۲ کے تحت عائد کردہ فردِ جرم سے برائت کے خلاف حکومت کی اپیل ہے۔ اس مقدمے کے مدعا علیہم عارف عبدالمتین، نذیر احمد اور سعادت حسن منٹو ہیں جن کے مقدمے بابت اشاعت فحشیات کی سماعت میاں اے۔ ایم۔ سعید، مجسٹریٹ درجۂ اوّل، لاہور نے کی اور ان میں سے پہلے دو کو تین سو روپے فی کس جرمانہ اور تیسرے کو تین ماہ کی قید بامشقت و نیز تین سو روپے جرمانہ کی سزا دی۔ اپیل کرنے پر جناب عنایت اللہ خاں، ایڈیشنل سیشن جج، لاہور نے مجسٹریٹ مذکور کے فیصلے کو کالعدم قرار دیا اور مدعا علیہ کو بری کر دیا۔

عارف عبدالمتین اردو کے ایک جریدے "جاوید" کا مدیر اور نذیر احمد اس کا ناشر ہے۔ مارچ ۱۹۴۹ء میں جریدۂ مذکور نے ایک مختصر افسانہ بعنوان "ٹھنڈا گوشت" شایع کیا جو سعادت حسن منٹو کا لکھا ہوا تھا۔ مدعا علیہم کی سزا کا سبب اس افسانے کی اشاعت تھی جسے استغاثہ نے مبینہ طور پر فحش اور تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ ۲۹۲ کے تحت قابلِ سزا قرار دیا۔ افسانے کی اشاعت اور تصنیف کا اقبال کیا گیا لیکن یہ عذرداری کی گئی کہ مذکورہ افسانہ ایک ادب پارہ ہے اور فحش نہیں ہے۔ فاضل مجسٹریٹ نے افسانے کو فحش قرار دیا لیکن فاضل ایڈیشنل سیشن جج نے عذر کو تسلیم کیا اور اپیل منظور کی۔ ہمارے سامنے سوال زیرِ غور یہ ہے کہ آیا مذکورہ افسانہ تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ ۲۹۲ کے مطابق "فحش" ہے یا نہیں ہے۔

افسانے کے صرف دو کردار ہیں : ایشر سنگھ اور اس کی داشتہ کلونت کور۔ ایشر سنگھ کو ایک مضبوط، توانا، غصیلے اور اکھڑ سکھ و نیز کلونت کور کو اسی جنتے کی توانا اور شہوت انگیز عورت کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے فرقہ وارانہ فسادات کے دوران ایشر سنگھ نے متعدد لوگوں کو تہِ تیغ کیا اور ان کی املاک کو غصب کر لیا۔ ایک دن اس نے ایک ایسے گھر پر حملہ کیا جس میں ایک خاندان کے سات افراد رہتے تھے۔ اس نے ان میں سے چھ کو مار ڈالا اور ساتویں کو، جو ایک خوبرو لڑکی تھی، اغوا کر لیا۔ اس لڑکی کو اپنے کندھوں پر ڈال کر اسے شہر کی جھاڑیوں میں لے گیا اور زمین پر لٹا دیا اور اس سے

Crown
v.
Saadat
Hassan
Minto
— —
Muhammad
Munir, CJ

لطف اندوز ہونے ہی والا تھا کہ اُس لڑکی کو مُردہ پاکر دہشت زدہ رہ گیا۔ چند دنوں بعد جب اُس نے کلونت کور کے ساتھ مباشرت کرنی چاہی تو اُس نے خود کو معذور پایا کیونکہ اس کا عضوِ جنس کام ہی نہ کر پاتا تھا۔ اس کے آٹھ روز بعد وہ دوبارہ کلونت کور کے پاس مباشرت کے مصمم ارادے کے ساتھ آیا اور گو کہ دونوں نے اپنی سی بہتیری کوشش کی تاہم ایشر سنگھ نے اب بھی خود کو جسمانی طور پر معذور پایا۔ کلونت کور کو یہ گمان گزرا کہ اس کے اور ایشر سنگھ کے درمیان کوئی دوسری عورت آگئی ہے چنانچہ اس نے طرح طرح کے سوالات کر ڈالے۔ اس پر ایشر سنگھ کو بتانا پڑا کہ اُس نے کیا کیا تھا اور اُس پر کیا گزری تھی۔

جہاں تک افسانے کے خاکے کا تعلق ہے، افسانہ قطعی طور پر بے ضرر ہے، گرچہ یہ سوال اُٹھتا ہے کہ جو کچھ بیان کیا گیا ہے، اُسے ممکنہ جنسی عمل سے تعبیر کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ استغاثے نے جس چیز کو فحش قرار دیا ہے، وہ افسانے کی جزئیات اور کلونت کور سے ایشر سنگھ کی گفتگو میں استعمال کیے ہوئے الفاظ ہیں۔ چند فقرے انتہائی مبتذل ہیں اور کچھ بھونڈے استعارے ہیں جو جنسی عمل کی ادائیگی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ سب سے قابلِ اعتراض منظر وہ ہے جہاں ایشر سنگھ کلونت کور سے دوبارہ ملتا ہے اور اُسے و نیز خود کو جنسی عمل کے لیے تیار کرتا ہے۔ اوباشی کے طریقۂ کار کو کھُلے بندوں بیان کیا گیا ہے۔ عبارت کلونت کور کے برہنہ جسم کے ذکر سے بھری ہوئی ہے اور کلونت کور کو "ابلتی ہانڈی" کی منزل پر لانے کے لیے ایشر سنگھ نے جو حرکتیں کیں، اس کی مکمل تفصیل پیش کرتی ہے۔ ان ابتدائی حرکات کو ایک استعارے "پھینٹنا" اور آخری عمل کو ایک اور استعارے "پتہ پھینکنا" کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔ شائستگی کے کسی بھی معیار کے مطابق یہ عبارت یقیناً فحش ہے۔ یہ صحیح ہے کہ شائستگی اور فحاشی کی اصطلاحیں اضافی ہیں اور ایک معاشرے میں جو چیز فحش یا ناشائستہ ہے، عین ممکن ہے کہ دوسرے معاشرے میں وہی چیز بالکل شائستہ اور اخلاقی تصور کی جائے۔ مگر اس سوال پر غور کرتے ہوئے کہ آیا کچھ الفاظ اور اسالیب فحش ہیں یا نہیں، ہمیں ایسے معیاروں کا اطلاق کرنا ہوگا جو اُس معاشرے میں مستعمل ہوں گے جہاں وہ الفاظ یا اسالیب ادا کیے گئے ہوں۔ اس ملک یا مہذب دنیا کے کسی بھی گوشے میں معاشرے کی موجودہ صورتِ حال کے پیشِ نظر اس امر میں شبہے کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ مباشرت کی تیاری کے عمل کا بیان خواہ کتنا ہی درست اور حقیقت کے مطابق ہو، اُسے بہر حال فحش سمجھا جائے گا۔ عدالت میں صفائی کی جانب سے یا گواہانِ عدالت کی حیثیت سے اس سوال پر کہ آیا افسانہ زیرِ بحث فحش تھا یا نہیں، بہت سے ادیبوں اور عالموں کے بیانات پر غور کیا گیا۔ ڈاکٹر آئی۔ لطیف، صدر شعبۂ نفسیات، ایف سی۔ کالج، لاہور، گواہِ صفائی سات نے بیان دیا کہ یہ افسانہ جنسی جذبات کو برانگیختہ کر سکتا ہے اور اسے کسی مقبول جریدے میں شایع نہیں ہونا چاہیے تھا۔ مولانا احسان اللہ خاں تاجور نجیب آبادی، پروفیسر دیال سنگھ کالج،

Crown v. Saadat Hassan Minto — — Muhammad Munir, CJ

لاہور گواہِ عدالت ایک نے مضمون متعلقہ کو اخلاق سوز، مبتذل اور گھٹیا اسلوب کا حامل قرار دیا اور کہا کہ اپنی چالیس سالہ ادبی زندگی میں اُن کا سابقہ کبھی بھی ایسی قبیح اور کراہت آمیز تحریر سے نہیں پڑا تھا۔ اسی طرح شورش کاشمیری، گواہِ عدالت دو نے یہ رائے ظاہر کی کہ اُس معاشرے اور خاندان کے پیشِ نظر جس سے وہ متعلق ہیں، ایسا فحش اور حیا سوز مضمون وہ کبھی بھی نہ شایع کریں گے اور نہ ہی اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کو اُسے پڑھنے کی اجازت دیں گے۔ مولانا ابو سعید بزمی، ایڈیٹر "احسان" لاہور، گواہِ عدالت تین نے بیان دیا کہ یہ افسانہ مخربِ اخلاق ہے۔

مدعا علیہ منٹو نے اپنے تحریری بیان میں اس نکتے پر زور دیا کہ مصنف کا منشا اس امر کا تعین کرتا ہے کہ استعمال کیے جانے والے الفاظ فحش ہیں یا نہیں۔ مدعا علیہ کے موقف کو متعدد ادیبوں کی تائید حاصل ہوئی ہے جنھوں نے صفائی کی طرف سے شہادتیں دی ہیں، مثلاً جناب عابد علی عابد، پرنسپل، دیال سنگھ کالج، لاہور، احمد سعید، پروفیسر دیال سنگھ کالج، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، صدر شعبۂ فلسفہ و نفسیات اور سابق ڈین جامعہ عثمانیہ، ڈاکٹر سعید اللہ، سویلین آفیسر، رائل پاکستان ائیر فورس اور صوفی غلام مصطفٰے تبسم، پروفیسر گورنمنٹ کالج، لاہور۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ عدالت میں یہ معاملہ اہلِ ادب کے مابین ایک اختلافی مسئلہ بن گیا اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اُن میں اس افسانے کے فحش ہونے کے بارے میں اختلافِ رائے پایا گیا۔ جن لوگوں نے اس افسانے کی اشاعت کو بے ضرر سمجھا ہے، ان کا ادب اور فن کی بابت تصوّر خواہ کچھ بھی ہو، انھیں یہ بات یاد دلانا ضروری ہے کہ قانون میں فحاشی کا تصوّر جن معنوں میں مستعمل ہے، اسے سمجھنے میں وہ یکسر غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں۔

Reg v. Hicklin 1868 L R 3 Q B 360 کے مقدمے لے کر تا حال، فحاشی کی یہ پہچان ہمیشہ قایم رہی ہے کہ کیا موردِ الزام امر میں ایسے ذہنوں کو بگاڑنے اور بداطواری کی جانب مائل کرنے کا میلان پایا جاتا ہے جو غیر اخلاقی اثرات کو قبول کر سکتے ہیں اور جن کے ہاتھوں میں اس نوع کی مطبوعات پہنچ سکتی ہیں، اور یہ کہ اس تصنیف کو شایع کرنے کا منشا یا ارادہ اسے فحش ہونے سے نہیں بچا سکتا، اگر اس کی تفصیلات فی نفسہٖ فحش ہوں۔ اس ملک کے کئی مقدمات میں یہ تعریف مسلسل تسلیم کی جاتی رہی ہے جس کی حالیہ مثال Kailashchandra Acharjya v. Emperor I L R 60 Cal. 201 کا مقدمہ ہے اور جس میں اس موضوع پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ افسانے کی وہ عبارت جس کی طرف اس فیصلے میں اوپر خصوصی اشارہ کیا گیا ہے، انتہائی مبتذل جنسی تفصیلات سے بھری پڑی ہے اور بلاشبہ دونوں صنفوں کے نوعمر ذہنوں، حتیٰ کہ خاصے معمر لوگوں کے ذہنوں میں بدکاری اور شہوت پرستی کے مذموم خیالات کی محرک ہو سکتی ہے۔ یہ سوال یہاں قطعاً غیر اہم ہے کہ اس افسانے کی

Crown
v.
Saadat
Hassan
Minto
— —
Muhammad
Munir, CJ

تصنیف میں مصنف کا منشا کیا تھا؟ ایسے معاملات میں اہمیت کا حامل منشا یا نیت نہیں بلکہ میلان ہوتا ہے۔ بات یوں نہ ہوتی تو ایک دوشیزہ جو مال روڈ پر برہنگی کی حالت میں جسم کے خطوط کی نمایش ٹہل ٹہل کر کر رہی ہوتی، اُسے کسی بھی فعلِ فحش کا قصوروار نہ سمجھا جاتا، اگر ایسا کرنے میں اُس کا منشا محض مسلکِ برہنگی کے جسمانی فوائد کا مظاہرہ ہوتا۔ لیکن متذکرہ مثال میں کیا اس امر کی بابت دو رائیں ہو سکتی ہیں کہ اُس کا یہ فعل فحش ہوگا یا نہیں ؟

اب جس نکتے پر غور کرنا باقی رہ جاتا ہے وہ مدعا علیہ کے فاضل وکیل کا پیش کردہ ہے۔ ہم نے پہلے ہی یہ بات واضح کر دی ہے کہ مدعا علیہم کے خلاف جو جرم ہے، اُس کا تعلق پورے افسانے سے ہے۔ فاضل وکیل کا اعتراض یہ ہے کہ فاضل ایڈیشنل سیشن جج نے مدعا علیہم کو جب بری کر دیا تو فاضل ایڈوکیٹ جنرل کا یہ فرض تھا کہ وہ افسانے کے اُن حصّوں کو مخصوص کرتے جو استغاثے کی نظر میں فحش تھے، خصوصاً جب کہ اپیل کے دلائل میں یہ الزام عاید کیا گیا کہ افسانے کے کچھ حصّے فحش ہیں۔ ہم اس اعتراض میں کوئی وزن نہیں پاتے کیونکہ یہ اشاعت جسے فحش ٹھہرایا گیا ہے، کوئی کتاب نہیں بلکہ صرف ایک مختصر افسانہ ہے جو تمام کا تمام فحش ہے۔ اس سے قطعِ نظر ہم نے اپیل کی سماعت کو اُس وقت ملتوی کر دیا جب یہ اعتراض اُٹھایا گیا تاکہ مدعا علیہم کے فاضل وکیل کو ایڈوکیٹ جنرل کی جانب سے وہ حصّے پہنچ جائیں جنھیں استغاثے نے فحش ٹھہرایا ہے۔ ان حصّوں کی بالآخر نشاندہی کر دی گئی اور اُن میں وہ اقتباس بھی شامل ہے جس کا ہم نے خصوصی حوالہ دیا ہے —— مذکورہ بالا وجوہات کی بنا پر ہم جملہ مدعا علیہم کو قصوروار قرار دیتے ہیں اور چونکہ پاکستان کے بعض ادبی حلقوں میں ادب میں شائستگی کی بابت نہایت گمراہ کن خیالات رواج پا گئے ہیں اور منٹو انہی حلقوں میں شامل ہے، اس لیے ہم مدعا علیہم میں ہر ایک کو مبلغ تین سو روپے جرمانے یا ایک ماہ کی قیدِ بامشقت کی سزا دیتے ہیں۔

Respondents sentenced.

○

ترجمہ : شمیم حنفی

○

پس منظر

آج کی تازہ خبر سنی آپ نے؟
کوریا کی؟
جی نہیں۔
بیگم جوناگڈھ کی؟
جی نہیں۔
قتل و غارت کی کسی نئی واردات کی؟
جی نہیں۔ ۔ ۔ سعادت حسن منٹو کی۔
کیوں۔ ۔ ۔ ؟ مر گیا؟
جی نہیں۔ کل گرفتار کر لیا گیا۔
فحاشی کے سلسلے میں؟
جی ہاں۔ ۔ ۔ پولیس نے اس کی خانہ تلاشی بھی لی۔
کوکین یا ناجائز شراب وغیرہ نکلی؟
نہیں۔ ۔ ۔ اخباروں میں لکھا تھا کہ اس کے مکان سے کوئی ناجائز چیز برآمد نہیں ہوئی۔
لیکن اس کا وجود بذاتِ خود ناجائز ہے۔
جی ہاں۔ ۔ ۔ کم از کم حکومت تو یہی سمجھتی ہے۔
پھر اسے برآمد کیوں نہ کیا گیا؟
یہ برآمد اور درآمد کا معاملہ حکومت کے اپنے ہاتھوں میں ہے جسے چاہے برآمد کرے، جسے چاہے درآمد کرے۔ سچ پوچھیے تو یہ کام حکومتوں ہی کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ وہ اس کا سلیقہ جانتی ہیں۔
اس میں کیا شک ہے۔ ۔ ۔
تو کیا خیال ہے آپ کا۔ ۔ ۔ ؟ اس مرتبہ تو منٹو کو پھانسی کی سزا ضرور ملنی چاہیے۔ ۔ ۔
مل جائے تو اچھا ہے۔ روز کا فتنہ ختم ہو۔
آپ نے ٹھیک کہا ہے۔ "ٹھنڈا گوشت" کے بارے میں ہائی کورٹ نے اس کے خلاف جو فیصلہ دیا ہے، اس کے بعد تو اس کمبخت کو خود بخود مر جانا چاہیے تھا۔ ۔ ۔ میرا مطلب ہے خودکشی کر لینی چاہیے تھی۔
اگر وہ اس کوشش میں ناکام رہتا۔ ۔ ۔
۔ ۔ ۔ تو اس پر یقیناً مقدمہ چلتا کہ اس نے اپنی جان لینے کی کوشش کی۔

میرا خیال ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ خودکشی سے باز رہا۔ ورنہ وہ باز رہنے والا آدمی نہیں۔

تو آپ کا مطلب ہے کہ وہ اپنی فحاشی جاری رکھے گا۔

اجی حضرت! یہ اس پر پانچواں مقدمہ ہے۔ اگر اسے باز رہنا ہوتا تو پہلے مقدمے کے بعد ہی تائب ہو کر کوئی شریفانہ کام شروع کر دیتا۔ مثال کے طور پر گورنمنٹ کی ملازمت کر لیتا یا گھی بیچتا، یا محلہ پیر گیلانیاں کے غلام احمد صاحب کی طرح کوئی دوا ایجاد کر لیتا۔

جی ہاں، ایسے سینکڑوں شریفانہ کام ہیں۔ مگر وہ پرلے درجے کا ہٹ دھرم ہے۔ لکھے گا اور ضرور لکھے گا۔

معلوم ہے آپ کو اس کا انجام کیا ہو گا؟

کچھ برا ہی نظر آتا ہے۔

چھ مقدمے اس پر پنجاب میں چل رہے ہوں گے، دس سندھ میں، چار صوبہ سرحد میں، تین مشرقی پاکستان میں...

وہ ان کی تاب نہ لا کر پاگل ہو جائے گا۔

دو مرتبہ تو پاگل ہو چکا ہے۔

یہ اس کی دور اندیشی تھی . . وہ ریہرسل کر رہا تھا تاکہ جب سچ مچ پاگل ہو جائے تو پاگل خانے میں آرام سے رہے۔

پاگل ہو کر کیا کرے گا؟

پاگلوں کو ہوش مند بنانے کی کوشش کرے گا۔

یہ بھی جرم ہے؟

معلوم نہیں۔ یہ تو کوئی وکیل ہی بتا سکتا ہے کہ تعزیرات پاکستان میں اس کے لیے کوئی دفعہ موجود ہے یا نہیں۔

ہونی چاہیے۔ پاگلوں کو ہوش مند بنانا دفعہ ۲۹۲ کی روشنی میں تو بہت خطرناک جرم معلوم ہوتا ہے۔

دفعہ ۲۹۲ کے بارے میں تو اب ہائی کورٹ نے "ٹھنڈا گوشت" کا فیصلہ کرتے ہوئے صاف طور پر کہہ دیا ہے کہ قانون کو مصنف کی نیت سے کوئی واسطہ نہیں۔ وہ نیک ہو یا بد، قانون کو تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ میلان کیا ہے۔

اسی لیے تو میں عرض کر رہا تھا کہ پاگلوں کو ہوش مند بنانے کے فعل میں نیت کیسی بھی ہو، اس کے میلان کو زیر غور رکھنا پڑے گا۔ اور ظاہر ہے کہ اس فعل کا میلان کسی صورت میں بھی بے ضرر قرار نہیں دیا جا سکتا۔

یہ قانونی موشگافیاں ہیں۔ ان سے ہمیں دور رہنا چاہیے۔

آپ نے بہت اچھا کیا جو بروقت تنبیہہ کر دی کیونکہ ایسی باتوں کے متعلق سوچنا ہی از خود ایک بڑا سنگین جرم ہے۔

لیکن حضرت، میں سوچتا ہوں، اگر منٹو سچ مچ پاگل ہو گیا تو اس کی بیوی بچوں کا کیا ہو گا؟

اس کے بیوی بچے جائیں جہنم میں۔ قانون کو ان سے کیا واسطہ۔

درست ہے لیکن حکومت کیا ان کی مدد نہیں کرے گی؟

ہاں، حکومت . . . حکومت کی بات جدا ہے۔ میرا خیال ہے اسے مدد کرنی چاہیے اور کچھ نہیں تو اخباروں میں اس بات کا اعلان کر دینا چاہیے کہ وہ اس کے متعلق غور کر رہی ہے۔

جب تک غور ہو گا، تب تک معاملہ صاف ہو جائے گا۔

ظاہر ہے۔ اب تک ہوتا تو ایسا ہی رہا ہے۔
لعنت بھیجیے منٹو اور اس کی بیوی بچوں پر۔ آپ یہ بتائیے، ہائی کورٹ کے فیصلے کا اُردو ادب پر کیا اثر ہوگا؟
اُردو ادب پر بھی لعنت بھیجیے۔
نہیں صاحب، ایسا نہ کہیے ۔ ۔ سُنا ہے کہ ادب قوم کا بہت بڑا سرمایہ ہوتا ہے۔
ہوگا بھائی ۔ ۔ ہم تو اسے سرمایہ کہتے ہیں جو نقدی کی صورت میں بینک میں پڑا ہو۔
لاکھ روپے کی بات کہی آپ نے ۔ ۔ تو مومن، میر، احسن، شوق، سعدی، حافظ وغیرہ سب دفعہ ۲۹۲ معاف کردے گی؟
کرنا چاہیے ورنہ اس کے وجود کا مطلب ہی کیا ہے۔
یہ جتنے ادیب اور شاعر بنے پھرتے ہیں، اب ان کو چاہیے کہ ہوش میں آئیں اور کوئی شریفانہ پیشہ اختیار کریں۔
لیڈر بن جائیں ۔ ۔
صرف مسلم لیگ کے؟
جی ہاں، میرا مطلب یہی تھا۔ کسی اور لیگ کا لیڈر بننا فحش ہے۔
بے حد فحش۔
لیڈری کے علاوہ اور بھی شریفانہ پیشے موجود ہیں ۔ ۔ ڈاک خانوں کے باہر بیٹھ کر پاکیزہ عبارت میں خطوط نویسی کریں۔ دیواروں پر اشتہار لکھیں۔ بے روزگاروں کے دفتر میں کلرک ہو جائیں ۔ ۔ نیا نیا ملک بنا ہے، ہزاروں آسامیاں خالی ہیں، کہیں بھی سما جائیں ۔ ۔ ۔
جی ہاں ۔ ۔ اتنی خالی زمین پڑی ہے۔
حکومت سوچ رہی ہے کہ طوائفوں اور رنڈیوں کے لیے راوی کے پاس ایک بستی بنا دے تاکہ شہر کی غلاظت دور ہو۔ کیوں نہ ان شاعروں، افسانہ نگاروں اور ادیبوں کو بھی ان میں شامل کر لیا جائے؟
بہت اچھا خیال ہے۔ یہ لوگ وہاں خوش رہیں گے۔
لیکن انجام کیا ہوگا؟
انجام کی کون سوچتا ہے ۔ ۔ جو ہونا ہوگا، ہو جائے گا ۔ ۔
ہاں ۔ ۔ وہاں پڑے جھک مارتے رہیں گے ۔ ۔ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ فحاشی کو فحاشی کاٹتی رہے گی۔
بڑا دلچسپ سلسلہ رہے گا۔
منٹو کو تو خاص طور پر وہاں اپنی دلچسپی کا من بھاتا سامان مل جائے گا۔
لیکن وہ کمبخت ان کا مجرا سننے کے بجائے ان پر لکھے گا۔ کئی سوگندھیاں، کئی سلطانائیں پیش کرے گا۔
اور کئی خوشیا، کئی ڈھونڈو ۔ ۔
معلوم نہیں، کمبخت کو ایسے گرے ہوئے انسانوں کو اٹھانے میں کیا مزا آتا ہے۔ ساری دُنیا انھیں ذلیل اور حقیر سمجھتی ہے مگر وہ ان کو سینے سے لگاتا ہے، ان کو پیار کرتا ہے۔

اس کی بہن عصمت نے اس کے متعلق کچھ ٹھیک ہی کہا تھا کہ منٹو کو عجیب وغریب تہلکہ ڈال دینے والی اور سوتوں کو چونکا دینے والی چیزوں سے بڑی رغبت ہے۔ وہ سوچتا ہے، اگر بہت سے لوگ سفید کپڑے پہنے بیٹھے ہوں، اور کوئی کیچڑ میں ل کر وہاں چلا جائے تو سب ہکا بکا رہ جائیں گے۔ ۔ ۔ سب لوگ رو پیٹ رہے ہوں، وہاں ایک اونچا قہقہہ لگا دو تو سب دم سادھ کر ٹکر ٹکر منہ دیکھنے لگیں گے۔ بس دھاک بیٹھ جائے گی، سکہ جم جائے گا۔ ۔ ۔

اس کا بھائی ممتاز حسین کہتا ہے: وہ نیکی کی تلاش میں نکلتا ہے اور اس کی ایک کرن ایسے انسان کے پیٹ سے نکالتا ہے جس کے بارے میں آپ اس قسم کی کوئی توقع ہی نہیں رکھتے۔ یہ ہے منٹو کا کارنامہ۔

یہ بڑی لغو حرکت ہے بلکہ فحش حرکت ہے کہ ایسے انسان کے پیٹ سے روشنی کی ایک کرن نکالی جائے جس میں سوائے انتڑیوں اور فضلے کے اور کچھ نہ ہو۔

اور کیچڑ مل کے سفید پوش لوگوں کے درمیان کود پڑنا۔ ۔ ۔

یہ اور بھی فحش ہے۔

یہ اتنی کیچڑ لاتا کہاں سے ہے؟

معلوم نہیں۔ کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈ نکالتا ہے۔

گندگی کا غوّاص جو ٹھہرا۔

آئیے ہم دعا مانگیں کہ خدا ہمیں اس کے لعنتی وجود سے نجات دلائے۔ ۔ ۔ اس میں خود منٹو کی بھی نجات ہے۔

اے خدا، اے رب العالمین۔ ۔ ۔ اے رحیم، اے کریم۔ ہم دو گنہگار بندے تیرے حضور گڑگڑا کر دعا مانگتے ہیں کہ تو سعادت حسن منٹو کو جس کے والد کا نام غلام حسن منٹو ہے اور جو بہت شریف، پرہیزگار اور خدا ترس آدمی تھا، اس دنیا سے اٹھا لے جہاں وہ خوشبوئیں چھوڑ دیتا ہے اور بدبوؤں کی طرف بھاگتا ہے۔ نور میں وہ اپنی آنکھیں نہیں کھولتا لیکن اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے۔ ستر سے اس کو کوئی دلچسپی نہیں، وہ صرف انسانوں کا ننگ دیکھتا ہے۔ مٹھائیوں سے اسے کوئی رغبت نہیں، کڑواہٹوں پر البتہ جان دیتا ہے۔ گھریلو عورتوں کی طرف وہ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا لیکن بیسواؤں سے گھل مل کے باتیں کرتا ہے۔ صاف اور شفاف پانی چھوڑ کے بدروؤں میں نہاتا ہے۔ جہاں رونا ہے، وہاں ہنستا ہے اور جہاں ہنسنا ہے، وہاں روتا ہے۔ کوئلوں کی دلالی میں جو اپنا منہ کالا کرتے ہیں، ان کی کالک صاف کر کے ہمیں دکھاتا ہے۔ تجھے بھول کر اس شیطان کے پیچھے مارا مارا پھرتا ہے جس نے تیری عدول حکمی کی تھی۔ ۔ ۔

اے رب العالمین، اس شرانگیز، نجس پسند اور شریر انسان کو اس دنیا سے اٹھا لے جس میں وہ بدکرداروں اور بد اطواروں کے

نامۂ اعمال کی سیاہیاں دھونے کی کوشش میں مصروف ہے . . .
اے خدا! وہ بہت شر پسند ہے۔ عدالتوں کے فیصلے اس کا ثبوت ہیں
لیکن یہ ارضی عدالتیں ہیں، تو اسے اس دنیا سے اٹھا اور اپنی آسمانی
عدالت میں اس کے خلاف مقدمہ چلا اور اس کو قرار واقعی سزا دے
لیکن دیکھ، اسے ادائیں بہت آتی ہیں۔ ایسا نہ ہو تجھے اس کی
کوئی ادا پسند آ جائے . . . تو سب کچھ جاننے والا ہے۔ ہماری
صرف یہ دعا ہے کہ وہ اس دنیا میں نہ رہے۔ رہے تو ہم
جیسا بن کر رہے، ہم جو ایک دوسرے کے عیبوں پر پردہ ڈالتے
ہیں .
ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد!

اوپر نیچے اور درمیان

یہ افسانہ

اوپر، نیچے اور درمیان

یہ افسانہ میرے ناشر نے چھاپنے سے انکار کر دیا۔ اس سلسلے میں ہم بہت اوپر نیچے ہوئے۔
قصہ یہ تھا کہ اس افسانے پر مجھ پر کراچی میں مقدمہ چلا تھا۔ سزا کے طور پر مجھے پچیس روپے جرمانہ ادا کرنا پڑا تھا۔
میں چاہتا تھا کہ اپنے ناشر سے مزید پچیس روپے لے لوں، تاکہ مجھے کسی قدر تسکین ہو جائے۔ مگر وہ نہ مانے۔
آخر میں نے اِدھر اُدھر سے اوپر نیچے، درمیان ہو کر کچھ روپے پیدا کیے اور یہ افسانہ چھپوایا، تاکہ آپ تک پہنچ جائے۔ آپ اس کو یقیناً شرفِ قبولیت بخشیں گے، اس لیے کہ آپ ناشر نہیں، میرے قاری ہیں۔

راقم

سعادت حسن منٹو

○

میاں صاحب

بہت دیر کے بعد آج مل بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے۔

بیگم صاحبہ

جی ہاں!

میاں صاحب

مصروفیتیں . . . بہت بچتا ہوں مگر نااہل لوگوں کا خیال کر کے قوم کی پیش کی ہوئی ذمہ داریاں سنبھالنی ہی پڑتی ہیں۔

بیگم صاحبہ

اصل میں آپ ایسے معاملوں میں بہت نرم دل واقع ہوئے ہیں، بالکل میری طرح۔

میاں صاحب

ہاں! مجھے آپ کی سوشل ایکٹی وٹیز کا علم ہوتا رہتا ہے۔ فرصت ملے تو کبھی اپنی وہ تقریریں بھجوا دیجیے گا جو پچھلے دنوں آپ نے مختلف موقعوں پر کی ہیں . . . میں فرصت کے اوقات میں ان کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں۔

بیگم صاحبہ

بہت بہتر۔

میاں صاحب

ہاں بیگم! وہ میں نے آپ سے اس بات کا ذکر کیا تھا!

بیگم صاحبہ

کس بات کا؟

میاں صاحب

میرا خیال ہے، ذکر نہیں کیا . . . کل اتفاق سے میں منجھلے صاحبزادے کے کمرے میں جا نکلا، وہ لیڈی چیٹرلیز لور پڑھ رہا تھا۔

بیگم صاحبہ

وہ رسوائے زمانہ کتاب!

میاں صاحب

ہاں بیگم۔

بیگم صاحبہ

آپ نے کیا کیا؟

میاں صاحب

میں نے اس سے کتاب چھین کر غائب کر دی۔

بیگم صاحبہ

بہت اچھا کیا آپ نے۔

میاں صاحب
اب میں سوچ رہا ہوں کہ ڈاکٹر سے مشورہ کروں اور اس کی روزانہ غذا میں تبدیلی کرا دوں۔
بیگم صاحبہ
بڑا صحیح قدم اٹھائیں گے آپ۔
میاں صاحب
مزاج کیسا ہے آپ کا؟
بیگم صاحبہ
ٹھیک ہے۔
میاں صاحب
میرا خیال تھا کہ آج آپ سے ... درخواست کروں۔
بیگم صاحبہ
اوہ! آپ بہت بگڑتے جا رہے ہیں۔
میاں صاحب
یہ سب آپ کی کرشمہ سازیاں ہیں۔
بیگم صاحبہ
لیکن آپ کی صحت؟
میاں صاحب
صحت؟ اچھی ہے۔ لیکن ڈاکٹر سے مشورہ کیے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا... اور آپ کی طرف سے بھی مجھے پورا اطمینان ہونا چاہیے۔
بیگم صاحبہ
میں آج ہی مس سلدھانا سے پوچھ لوں گی۔
میاں صاحب
اور میں ڈاکٹر جلال سے۔
بیگم صاحبہ
قاعدے کے مطابق ایسا ہی ہونا چاہیے۔
میاں صاحب
اگر ڈاکٹر جلال نے اجازت دے دی؟
بیگم صاحبہ
اگر مس سلدھانا نے اجازت دے دی... ! مفلر اچھی طرح لپیٹ لیجیے۔ باہر سردی ہے۔
میاں صاحب
شکریہ!

○

ڈاکٹر جلال

تم نے اجازت دے دی؟

مِس سلڈھانا

جی ہاں!

ڈاکٹر جلال

مَیں نے بھی اجازت دے دی۔ ۔ ۔ حالانکہ شرارت کے طور پر۔ ۔

مِس سلڈھانا

حالانکہ شرارت کے طور پر مَیں بھی چاہتی تھی کہ اجازت نہ دوں۔

ڈاکٹر جلال

لیکن مجھے ترس آگیا۔

مِس سلڈھانا

مجھے بھی۔

ڈاکٹر جلال

پورے ایک برس کے بعد وہ۔ ۔ ۔

مِس سلڈھانا

ہاں پورے ایک برس کے بعد۔

ڈاکٹر جلال

میری انگلیوں کے نیچے اس کی نبض تیز ہوگئی، جب مَیں نے اس کو اجازت دی۔

مِس سلڈ ھانا

اس کی بھی یہی کیفیت تھی۔

ڈاکٹر جلال

اس نے مجھ سے ڈرتے ہوئے کہا، "ڈاکٹر! ایسا معلوم ہوتا ہے، میرا دل کمزور ہو گیا ہے۔۔۔ آپ کارڈیوگرام لیجیے۔۔۔!"

مِس سلڈ ھانا

اس نے بھی مجھ سے یہی کہا۔

ڈاکٹر جلال

مَیں نے اس کے ٹیکہ لگا دیا۔

مِس سلڈ ھانا

مَیں نے بھی۔۔۔ صرف سادہ پانی کا۔

ڈاکٹر جلال

سادہ پانی بہترین چیز ہے۔

مِس سلڈ ھانا

جلال! اگر تم اس بیگم کے شوہر ہوتے؟

ڈاکٹر جلال

اگر تم اس میاں کی بیوی ہوتیں؟

مِس سلڈ ھانا

میرا کیریکٹر خراب ہو گیا ہوتا!

ڈاکٹر جلال

میرا جنازہ اُٹھ گیا ہوتا!

مِس سلڈ ھانا

یہ بھی تمھارے کیریکٹر کی خرابی کہلاتی۔

ڈاکٹر جلال

ہم جب بھی سوسائٹی کے ان اُلوؤں کو دیکھنے آتے ہیں، ہمارا کیریکٹر خراب ہو جاتا ہے۔

مِس سلڈ ھانا

آج بھی ہوگا؟

ڈاکٹر جلال

بہت زیادہ۔

مِس سلڈ ھانا

مگر مصیبت یہ ہے کہ ان کا لمبے لمبے وقفوں کے بعد ہوتا ہے۔

بیگم صاحبہ

لیڈی چیٹرلیز لور، یہ آپ نے تکیے کے نیچے کیوں رکھی ہوئی ہے؟

میاں صاحب

میں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ کتاب کتنی بے ہودہ اور واہیات ہے۔

بیگم صاحبہ

میں بھی آپ کے ساتھ دیکھوں گی۔

میاں صاحب

میں جستہ جستہ دیکھوں گا۔ پڑھتا جاؤں گا۔ آپ بھی سنتی جائیے۔

بیگم صاحبہ

یہ بہت اچھا رہے گا۔

میاں صاحب

میں نے منجھلے صاحبزادے کی روزانہ غذا میں ڈاکٹر کے مشورے سے تبدیلیاں کرا دی ہیں۔

بیگم صاحبہ

مجھے یقین تھا کہ آپ نے اس معاملے میں غفلت نہیں برتی ہو گی۔

میاں صاحب

میں نے اپنی زندگی میں کبھی آج کا کام کل پر نہیں چھوڑا۔

بیگم صاحبہ

میں جانتی ہوں۔ ۔ ۔ اور خاص کر آج کا کام تو آپ کبھی۔ ۔ ۔

میاں صاحب

آپ کا مزاج کتنا شگفتہ ہے۔ ۔ ۔

بیگم صاحبہ

یہ سب آپ کی کرشمہ سازیاں ہیں۔

میاں صاحب

میں بہت محظوظ ہوا ہوں۔ ۔ ۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو۔ ۔ ۔

بیگم صاحبہ
ٹھہریئے! کیا آپ نے دانت صاف کیے؟
میاں صاحب
جی ہاں! میں دانت صاف کرکے اور ڈیٹول کے غرارے کرکے آیا تھا۔
بیگم صاحبہ
میں بھی۔
میاں صاحب
اصل میں ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے بنائے گئے تھے۔
بیگم صاحبہ
اس میں کیا شک ہے۔
میاں صاحب
میں جستہ جستہ یہ بے ہودہ کتاب پڑھنا شروع کروں۔
بیگم صاحبہ
ٹھہریئے! ذرا میری نبض دیکھیے۔
میاں صاحب
کچھ تیز چل رہی ہے۔ . . میری دیکھیے۔
بیگم صاحبہ
آپ کی بھی تیز چل رہی ہے۔
میاں صاحب
وجہ؟
بیگم صاحبہ
دل کی کمزوری!
میاں صاحب
یہی وجہ ہو سکتی ہے۔ . . لیکن ڈاکٹر جلال نے کہا تھا، کوئی خاص بات نہیں۔
بیگم صاحبہ
مس سلڈھانا نے بھی یہی کہا تھا۔
میاں صاحب
اچھی طرح امتحان کرکے اس نے اجازت دی تھی؟
بیگم صاحبہ
بہت اچھی طرح امتحان کرکے اجازت دی تھی۔

میاں صاحب

تو میرا خیال ہے، کوئی حرج نہیں۔

بیگم صاحبہ

آپ بہتر سمجھتے ہیں۔۔۔ ایسا نہ ہو، آپ کی صحت۔۔۔

میاں صاحب

اور آپ کی صحت بھی۔۔۔

بیگم صاحبہ

اچھی طرح سوچ سمجھ کر ہی قدم اُٹھانا چاہیے۔

میاں صاحب

مس سلڈھانا نے اس کا تو بندوبست کر دیا ہے نا؟

بیگم صاحبہ

کس کا۔۔۔؟ ہاں، ہاں، اس کا تو بندوبست کر دیا ہے اس نے۔

میاں صاحب

یعنی اس طرف سے تو پُورا اطمینان ہے۔

بیگم صاحبہ

جی ہاں!

میاں صاحب

ذرا اب دیکھیے نبض؟

بیگم صاحبہ

اب تو۔۔۔ ٹھیک چل رہی ہے۔۔۔ میری؟

میاں صاحب

آپ کی بھی نورمل ہے۔

بیگم صاحبہ

اس بے ہودہ کتاب کا کوئی پیرا تو پڑھیے۔

میاں صاحب

بہتر۔۔۔ نبض پھر تیز ہو گئی۔

بیگم صاحبہ

میری بھی۔

میاں صاحب

نوکروں سے مطلوبہ سامان رکھوا دیا آپ نے کمرے میں؟

بیگم صاحبہ

جی ہاں! سب چیزیں موجود ہیں۔

میاں صاحب

اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو میرا ٹمپریچر لے لیجیے۔

بیگم صاحبہ

کیا آپ تکلیف نہیں کر سکتے . . . اسٹاپ واچ موجود ہے۔ نبض کی رفتار بھی دیکھ لیجیے۔

میاں صاحب

ہاں! یہ بھی نوٹ ہونی چاہیے۔

بیگم صاحبہ

سملنگ سالٹ کہاں ہے؟

میاں صاحب

دوسری چیزوں کے ساتھ ہونا چاہیے۔

بیگم صاحبہ

جی ہاں! پڑا ہے تپائی پر۔

میاں صاحب

کمرے کا ٹمپریچر، میرا خیال ہے، تھوڑا سا بڑھا دینا چاہیے۔

بیگم صاحبہ

میرا بھی یہی خیال ہے۔

میاں صاحب

نقاہت زیادہ ہو گئی تو مجھے دوا دینا نہ بھولیے گا!

بیگم صاحبہ

میں کوشش کروں گی اگر . . .

میاں صاحب

ہاں ہاں . . . ! بصورتِ دیگر آپ تکلیف نہ اٹھائیے گا۔

بیگم صاحبہ

آپ یہ صفحہ . . . یہ پورا صفحہ پڑھیے . . .

میاں صاحب

سنیے . . . !

بیگم صاحبہ

یہ آپ کو چھینک کیوں آئی؟

میاں صاحب
معلوم نہیں۔
بیگم صاحبہ
حیرت ہے۔
میاں صاحب
مجھے خود حیرت ہے۔
بیگم صاحبہ
اوہ . . . مَیں نے کمرے کا ٹمپریچر بڑھانے کے بجائے گھٹا دیا تھا . . . معافی چاہتی ہوں
میاں صاحب
یہ اچھا ہوا کہ چھینک آگئی اور بروقت پتہ چل گیا۔
بیگم صاحبہ
مجھے بہت افسوس ہے۔
میاں صاحب
کوئی بات نہیں۔ بارہ قطرے برانڈی اس کی تلافی کر دیں گے۔
بیگم صاحبہ
ٹھہریئے . . . ! مجھے ڈالنے دیں۔ آپ سے گننے میں غلطی ہو جایا کرتی ہے۔
میاں صاحب
یہ تو درست ہے۔ آپ ڈال دیجیے۔
بیگم صاحبہ
آہستہ آہستہ پیجیے۔
میاں صاحب
اس سے زیادہ آہستہ اور کیا ہوگا؟
بیگم صاحبہ
طبیعت بحال ہوئی؟
میاں صاحب
ہو رہی ہے۔
بیگم صاحبہ
آپ تھوڑی دیر آرام کر لیں۔
میاں صاحب
ہاں . . . مَیں خود اس کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔

○

نوکر

کیا بات ہے، آج بیگم صاحبہ نظر نہیں آئیں؟

نوکرانی

طبیعت ناساز ہے ان کی۔

نوکر

میاں صاحب کی طبیعت بھی ناساز ہے۔

نوکرانی

ہمیں معلوم ہی تھا۔

نوکر

ہاں! لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

نوکرانی

کیا؟

نوکر

یہ قدرت کا تماشا . . ہمیں تو آج بستر مرگ پر ہونا چاہیے تھا۔

نوکرانی

کیسی باتیں منہ سے نکالتے ہو۔ بستر مرگ پر ہوں وہ . . .

نوکر

نہ چھیڑو ان کے بستر مرگ کا ذکر . . بڑا شاندار ہوگا . . .
خواہ مخواہ میرا جی چاہے گا کہ اُٹھا کر اپنی کوٹھری میں لے جاؤں۔

نوکرانی

کہاں چلے؟

نوکر

بڑھئی ڈھونڈنے جا رہا ہوں . . چارپائی اب بالکل جواب دے چکی ہے۔

نوکرانی

ہاں! اس سے کہنا، مضبوط لکڑی لگائے۔

مہدی علی صدیقی کا مضمون "منٹو اور میں" جسے ہم "پانچواں مقدمہ (۳)" کے عنوان سے شائع کر رہے ہیں، منٹو کی موت کے چند ماہ بعد شائع ہوا تھا۔ مہدی علی صدیقی کے علم میں نہیں تھا کہ منٹو "پانچواں مقدمہ" کی دوسری قسط (اور آخری) مرنے سے پہلے لکھ چکا تھا۔ "پانچواں مقدمہ (۲)"، "پانچواں مقدمہ (۳)" کی اشاعت کے تقریباً دو برس بعد شائع ہوا۔

پانچواں مقدمہ

پانچواں مقدمہ

ایک

اپنے افسانوں کے سلسلے میں مجھ پر چار مقدمے چل چکے ہیں، پانچواں اب چلا ہے جس کی رُوداد میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔

پہلے چار افسانے جن پر مقدمہ چلا، ان کے نام حسبِ ذیل ہیں۔

ایک : کالی شلوار

دو : دھواں

تین : بُو

چار : ٹھنڈا گوشت

اور

پانچواں : اوپر، نیچے اور درمیان

پہلے تین افسانوں میں تو میری خلاصی ہوگئی : "کالی شلوار" کے سلسلے میں مجھے دلّی سے دو تین بار لاہور آنا پڑا "دھواں" اور "بُو" نے مجھے بہت تنگ کیا، اس لیے کہ مجھے بمبئی سے لاہور آنا پڑتا تھا۔ . .

. . . لیکن "ٹھنڈا گوشت" کا مقدمہ سب سے بازی لے گیا۔ اس نے میرا انجر کس نکال دیا۔

یہ مقدمہ گو یہاں پاکستان ہی میں ہوا، مگر عدالتوں کے چکّر کچھ ایسے تھے جو مجھ ایسا حسّاس آدمی برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ عدالت ایک ایسی جگہ ہے جہاں ہر توہین برداشت کرنا ہی پڑتی ہے۔

خدا کرے، کسی کو جس کا نام "عدالت" ہے، سے واسطہ نہ پڑے —— ایسی عجیب جگہ مَیں نے کہیں بھی نہیں دیکھی۔

پولیس والوں سے مجھے نفرت ہے —— ان لوگوں نے میرے ساتھ ہمیشہ ایسا سلوک کیا ہے جو گھٹیا قسم کے اخلاقی ملزموں سے کیا جاتا ہے۔

پچھلے دنوں جب کراچی کے ایک پرچے "پیامِ مشرق" نے میری اجازت کے بغیر میرا مضمون "اوپر، نیچے اور درمیان"، لاہور کے اخبار "احسان" سے نقل کیا تو کراچی کی حکومت نے میرا وارنٹ جاری کر دیا۔

——— میں گھر پر نہیں تھا۔ پولیس کے دو سب انسپکٹر، چار سپاہیوں کے ساتھ آئے اور میرے گھر کا محاصرہ کر لیا۔

میری بیوی نے ان سے کہا کہ منٹو باہر گیا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو میں اسے ابھی بلا لیتی ہوں ——— وہ مصر تھے کہ منٹو گھر ہی میں ہے اور میری بیوی جھوٹ بول رہی ہے۔

جب پولیس آئی تھی، میں اس وقت چوہدری نذیر احمد کی دوکان "نیا ادارہ" میں جو "سویرا" کا دفتر بھی ہے، بیٹھا تھا اور میں نے ایک افسانہ لکھنا شروع کیا تھا:

اس افسانے کی میں نے بمشکل دس سطریں لکھی ہوں گی کہ چوہدری رشید احمد صاحب جو چوہدری نذیر کے چھوٹے بھائی ہیں اور "مکتبہ جدید" کے مالک ہیں، تشریف لائے ——— انھوں نے کچھ توقف کے بعد پوچھا: "یہ آپ کیا لکھ رہے ہیں؟"

میں نے جواب دیا: "ایک افسانہ شروع کیا ہے . . . اور یہ بہت لمبا ہوگا۔"

چوہدری رشید صاحب نے بڑے تشویش ناک لہجے میں کہا: "میں آپ کو ایک بہت بُری خبر سنانے آیا ہوں۔"

ظاہر ہے کہ میرا ردِ عمل کیا ہوگا ——— چند منٹ تو میں سوچتا رہا کہ "بہت بُری خبر" کیا ہو سکتی ہے۔ کئی خیال دماغ میں آئے۔ میں اوپر، نیچے اور درمیان ہوتا رہا مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

آخر میں نے چوہدری رشید سے پوچھا کہ بھائی، قصہ کیا ہے؟

انھوں نے کہا: "قصہ یہ ہے کہ پولیس آپ کے گھر کے دروازے کے باہر کھڑی ہے۔ وہ مصر ہے کہ آپ گھر میں موجود ہیں، اس لیے وہ زبردستی اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔"

میرے پاس احمد راہی اور حمید اختر بیٹھے تھے۔ جب انھوں نے یہ سنا تو وہ بہت مضطرب ہوئے۔ چنانچہ وہ بھی میرے ساتھ ہو لیے۔

ہم نے تانگہ لیا اور گھر روانہ ہوئے۔

جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ فلیٹ کے دروازے کے پاس پولیس کھڑی ہے۔

میرا بھانجا (حامد جلال) اور برادرِ نسبتی (ظہیر الدین) اپنی موٹروں کے پاس کھڑے پولیس والوں سے محوِ گفتگو تھے اور ان سے کہہ رہے تھے کہ اگر آپ تلاشی لینا چاہتے ہیں تو لے سکتے ہیں۔ آپ یقین مانیے کہ منٹو گھر میں نہیں ہے۔

وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ میں، احمد راہی اور حمید اختر تانگے میں گھر پہنچ گئے ——— میں نے راستے میں چوہدری رشید صاحب سے کہہ دیا تھا کہ وہ مختلف اخباروں کو ٹیلی فون کر دیں تاکہ [illegible] جو کچھ میرے ساتھ گزرے، اخباروں میں چھپ جائے۔

میں، حمید اختر اور احمد راہی جب گھر پہنچے تو دیکھا کہ عبداللہ ملک کھڑا پولیس کے افسروں سے گفتگو میں مصروف ہے۔

عبداللہ ملک کمیونسٹ ہے۔ اس کی تحریر ہمیشہ سُرخ ہوتی ہے حالانکہ میں نے اس میں کبھی وہ سُرخی نہیں دیکھی جو اصل سُرخی ہے۔

عبداللہ کمیونسٹ میرے مکان کے باہر کھڑا تھا اور سب انسپکٹروں اور سپاہیوں سے گفتگو کر رہا تھا کہ میں، احمد راہی اور حمید اختر تانگے میں پہنچے۔

سب انسپکٹروں اور سپاہیوں نے میری بیوی اور میری بہن کو یہ دھمکی دی تھی کہ وہ تلاشی لینا چاہتے ہیں اور اگر دروازے نہ کھولے گئے تو وہ زبردستی اندر گھس آئیں گے۔

میں جب پہنچا اور باہر کمپاؤنڈ میں ان پولیس افسروں سے ملاقات ہوئی تو میرا خیال ہے کہ انھیں بقدرِ کفایت ندامت ہوئی ——— میں نے انھیں اندر مکان میں تشریف لانے کے لیے کہا۔ یہ دعوت انھوں نے قبول فرمائی اور اندر تشریف لے آئے۔

دو افسر تھے، بڑے اکھڑ قسم کے ——— میں نے ان سے ملاقات کی وجہ پوچھی تو انھوں نے فرمایا کہ کراچی سے وارنٹ آئے ہیں کہ آپ کی خانہ تلاشی لی جائے۔

مجھے بڑی حیرت ہوئی ——— میں کوئی خفیہ فروش نہیں ہوں۔ افیون نہیں بیچتا، شراب کا غیر قانونی کاروبار نہیں کرتا۔ میرے پاس کوکین بھی نہیں ہے، پھر یہ پولیس والے جو کراچی سے وارنٹ لے کر آئے ہیں، میری خانہ تلاشی کیوں لے رہے ہیں۔

پولیس افسر جب اندر تشریف لائے تو انھوں نے مجھ سے پہلے یہ سوال کیا کہ تمھاری لائبریری کہاں ہے؟

میں ان سے کیا کہتا ——— میری لائبریری یہاں پاکستان میں چند کتابوں پر مشتمل ہے۔ ان میں تین ڈکشنریاں یا لغت ہیں۔

میں نے ان سے عرض کی: ”میری جتنی کتابیں تھیں، وہ تو بمبئی میں رہ گئیں۔ آپ کو اگر کسی پرچے یا پرزے کی تلاش ہے تو آپ بمبئی تشریف لے جائیں۔ ایڈریس حاضر ہے۔“

وہ افسر کچھ ایسے بدذوق تھے کہ انھوں نے اس بذلہ سنجی کی داد نہ دی اور میری خانہ تلاشی شروع کر دی ——— خانہ، میرا میخانہ نہیں۔ بیئر کی آٹھ دس خالی بوتلیں ضرور تھیں، لیکن پولیس افسروں نے ان کو دیکھنے کی زحمت نہ کی۔

الماریوں میں چینی کے پیالے تھے۔ ایک تپائی پر چھوٹا سا بکس تھا جس میں کچھ کاغذات تھے ——— پولیس افسروں نے ایک ایک پرزہ دیکھا۔ اخباروں کے چند تراشے تھے، وہ انھوں نے اپنے قبضے میں لے لیے۔

اس کے بعد میں نے ان افسروں سے کہا کہ اب براہِ کرم تلاشی کے وارنٹ جو دارالحکومت کراچی سے آئے ہیں، مجھے دکھا دیجیے ——— مگر انھوں نے انکار کر دیا۔

وارنٹ کا کاغذ ایک حوالدار کے ہاتھ میں تھا، اس نے مجھے دُور سے دکھاتے ہوئے کہا: ”یہ ہے...“

میں نے اس سے پوچھا: ”یہ کیا ہے؟“

اس نے جواب دیا: ”یہ وہی چیز ہے جس کے ذریعے سے ہم یہاں پہنچے ہیں۔“

جب میں نے اصرار کیا کہ میں یہ کاغذ دیکھے بغیر نہیں ٹلوں گا تو انھوں نے وارنٹ کا کاغذ دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑے رکھا اور کہنے لگے: ”آپ پڑھ لیجیے...“

میں نے سرسری طور پر پڑھا تو مجھے معلوم ہوا کہ خانہ تلاشی کے علاوہ یہ کاغذ میری گرفتاری کا وارنٹ بھی ہے۔

اب ضمانت کا مرحلہ درپیش آیا۔

پولیس افسر کچھ اتنے خودسر تھے کہ انھوں نے کسی کی ضمانت قبول نہ کی —— میرا بھانجا تھا گزیٹڈ افسر، میرا برادرِ نسبتی، وہ بھی گزیٹڈ افسر، مگر پولیس والوں نے ان کی ضمانت قبول نہ کی۔ ان سے یہ کہہ کر کہ آپ حکومت کے ملازم ہیں، ہوسکتا ہے کہ آپ کل برطرف کر دیے جائیں۔

قصّہ مختصر یہ ہے کہ مَیں نے دو مرتبہ اپنی علالت کے باعث کراچی کی عدالت کو عذرت نامہ معہ ڈاکٹری سرٹیفیکیٹ پیش کیا کہ مَیں حاضرِ عدالت نہیں ہوسکتا، لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ مجھے بالآخر کراچی جانا ہی پڑا۔

ایک دلچسپ لطیفہ: یہاں جب آخری وارنٹ آئے تو ضمانت دینے کے لیے گھر میں کوئی موجود نہیں تھا۔

مَیں اپنے بہت سے دوستوں کے پاس گیا مگر ان میں سے کوئی بھی نہ ملا —— آخر محمد طفیل صاحب کے پاس گیا۔ وہ بڑے شریف آدمی ہیں، میرے ساتھ بادلِ ناخواستہ یا خواستہ ہولیے۔ ضمانت ہوگئی، اس لیے کہ ان کا ایک ادبی ادارہ ہے (وہ "نقوش" کے مالک بھی ہیں اور مدیر بھی) اور ان کی دکان میں جتنی کتابیں ہیں، وہ اس کی ضمانت ہیں کہ وہ پانچ ہزار روپے کی ضمانت دے سکتے ہیں۔

ایک اور لطیفہ سنیے: طفیل صاحب نے ضمانت تو دے دی مگر انھیں یہ خطرہ پیدا ہوگیا کہ شاید میں تاریخِ مقررہ پر حاضرِ عدالت نہیں ہوں گا۔

خدا گواہ ہے کہ میرے پاس زہر کھانے کو بھی ایک پیسہ نہ تھا —— طفیل صاحب صبح پانچ بجے میرے غریب خانے پر تشریف لائے۔ ان کی جیب میں سیکنڈ کلاس کے دو ٹکٹ تھے —— تانگے کا خرچ بھی انھوں نے دیا۔ اسٹیشن تک چھوڑنے گئے اور جب تک گاڑی کراچی روانہ نہ ہوئی، وہ میرے ساتھ رہے —— میرے ساتھ انھوں نے میرا ایک دوست نصیر انور کر دیا تھا، تاکہ میں کراچی یقینی طور پر پہنچ جاؤں۔

کراچی میں جو کچھ مجھ پر بیتی، اس کا حال آپ کو پھر کبھی سناؤں گا، اس لیے کہ سخت بیمار ہوں۔

پانچواں مقدمہ

دو

(پانچواں مقدمہ) : . . . "نقوش" کے کسی پچھلے شمارے میں (شمارہ : ۳۰ - ۲۹ ؛ فروری - مارچ ، ۱۹۵۳ء)
اس عنوان سے میں نے ایک مضمون لکھنا شروع کیا تھا لیکن مکمل نہ کر سکا تھا ۔ اس لیے کہ میں سخت بیمار تھا ——— بیمار تو میں اب بھی ہوں ، اور میرا خیال ہے کہ سدا بیمار رہوں گا ۔ بعض احباب کہتے ہیں کہ تمھاری یہ بیماری ہی سب کچھ ہے ، یعنی میری مضمون نگاری اور افسانہ نویسی ۔

طفیل صاحب جو اس پرچے کے مالک اور ایڈیٹر ہیں ، انھوں نے میرے متعلق ایک مضمون بھی "منٹو صاحب" کے عنوان سے لکھا ہے ——— اس مضمون پر برادرم احمد ندیم قاسمی نے جو بدقسمتی سے "امروز" کے قائم مقام ایڈیٹر مقرر ہو گئے ہیں ، درج ذیل تبصرہ کیا ہے ، "نقاد" کے نام سے ۔

> محمد طفیل کا مضمون "منٹو صاحب" شخصی اور بہت حد تک نجی حیثیت رکھتا ہے ، اور ہمارے خیال میں طفیل صاحب کو اُن "رازہائے درونِ پردہ" کو درونِ پردہ ہی رکھنا چاہیے تھا جو منٹو صاحب کے اور ان کے مراسم سے متعلق ہیں ——— ناشر اور ادیب نیز ایڈیٹر اور ادیب کے تعلقات کا یوں سرِبازار اعلان ہونے لگے تو نہ ناشروں کو کہیں ٹھکانہ ملے اور نہ ادیبوں کو ——— کمزوریاں اور خامیاں کس میں نہیں ہوتیں لیکن ان کو چھاپے کے حوالے کر دینا کم از کم ہماری نظر میں حدِ اعتدال سے تجاوز کرنا ہے ۔ یہ درست ہے کہ ادیبوں اور فن کاروں کی ننھی ننھی خامیوں پر سے نقاب کشائی ان کی شخصیت کو زیادہ اُجاگر کرنے میں مدد دیتی ہے ، مگر ایسی نقاب کشائی بھی کیا کہ دوسرا آدمی ننگو بن کر رہ جائے ——— مضمون کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ طفیل صاحب کی نیت بُری نہیں ؛ جذبات کی رو میں آ کر وہ چند باتیں ایسی کہہ گئے ہیں جو نہ کہی جاتیں یا یوں نہ کہی جاتیں تو بہتر تھا ۔

میں اس تبصرے سے پہلے طفیل صاحب کو یہ خط لکھ چکا تھا :

برادرم ، السلام علیکم ۔

کل رات مجھے صفیہ نے بتایا تھا کہ آپ نے مجھ پر "نقوش" میں مضمون لکھا ہے ——— زیادہ پینے کی وجہ سے مجھ سے ٹھیک پڑھا نہیں جا رہا تھا؛ چونکہ صفیہ کو مضمون پسند تھا، اس لیے اس نے میرے کہنے پر ادھر اُدھر سے سنایا جو مجھے قطعاً پسند نہ آیا؛ یہی سبب ہوا کہ میں نے آپ کو آدھی درجن کے قریب گالیاں دیں! اور اس کے بعد مجھے نیند آگئی۔

صبح اٹھ کر اپنی آنکھوں سے مضمون پڑھا تو مجھے پسند آگیا ——— آپ نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے مجھے انکار نہیں: اپنی کمزوریوں کے باوجود (میں) بے حد خوش ہوں کہ آپ نے جو کچھ لکھا ہے، اس میں ہچکچاہٹ کا شائبہ تک نہیں؛ جو کچھ میں ہوں، وہ اس مضمون میں موجود ہے، بلکہ وافر موجود ہے ——— اس (مضمون) میں بعض باتیں ایسی (موجود) ہیں جو مجھ میں موجود تھیں مگر میرے لیے محسوس کی حد سے باہر تھیں۔

خاکسار سعادت حسن منٹو

میں اب اس (مضمون) کے متعلق کچھ اور کہنا نہیں چاہتا ——— جو حقیقت ہے، اس سے مجھے کبھی انکار نہیں ہوگا؛ میں اگر شراب پیتا ہوں تو میں اس سے کیوں انکار کروں؛ میں نے اگر کسی سے اُدھار لیا ہے تو مجھے اس سے بھی انکار نہیں ہونا چاہیے! اگر مجھے دنیا اس لحاظ سے بُرا سمجھتی ہے تو سمجھا کرے ——— میں اگر دنیا کی ایسی باتوں کے متعلق ہی سوچتا رہتا تو میرا خیال ہے کہ میں سو سے زیادہ افسانوں کا مصنف نہ ہوتا۔

صاحبِ نقد و نظر (احمد ندیم قاسمی) فرماتے ہیں: یہ درست ہے کہ ادیبوں اور فنکاروں کی ننھی ننھی خامیوں پر سے نقاب کشائی ان کی شخصیت کو زیادہ اُجاگر کرنے میں مدد دیتی رہی ہے، مگر ایسی نقاب کشائی بھی کیا کہ وہ دوسرا آدمی نکو بن کر رہ جائے ——— مجھے معلوم نہیں کہ طفیل صاحب کے مضمون کے بعد میں نکو بن کے رہ گیا ہوں یا نہیں؛ اس کا فیصلہ ہو تا رہے گا۔

مجھے طفیل صاحب کے اس مضمون کے متعلق صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ انھوں نے اپنے بیمار بھائی کے دوا دارو کو محض اس لیے پس پشت رکھا اور میری مدد فرمائی کہ انھیں اپنے بزرگوں کا یہ قول یاد آگیا تھا کہ کسی کی ضمانت ہرگز ہرگز نہیں دینی چاہیے، جس کا مجھے افسوس ہے؛ اگر مجھے ان کی اس کمزوری کا علم ہوتا تو میں کبھی عدالت میں حاضر نہ ہوتا؛ وہ گرفتار ہوتے، اور جب وہ کسی ضامن کی تلاش کرتے تو میں ان سے کہتا کہ حضرت بزرگوں کی اس نصیحت کو پیش نظر رکھیے جس کو آپ محض مروت کی خاطر بھول گئے . . . ضمانت کو چھوڑیے اور چلیے میرے ساتھ جیل میں . . .

جیسا کہ آپ نے اس مضمون کی پہلی قسط میں پڑھا ہوگا، یہ میرے پانچویں مقدمے کی روداد ہے۔

میں و میرا دوست نصیر انور اسٹیشن پہنچے؛ ٹکٹ طفیل صاحب نے لے ہی دیے تھے، مگر اب سوال یہ تھا کہ جگہ کیسے ملے ——— (پھر) ہمارے پاس بستر کی تولمیں (بھی) تھیں، (اور) گاڑی میں ان کے لیے بھی جگہ نہ تھی

مجھے معاً یاد آیا کہ میرا ایک ہم جماعت یعقوب توفیق لاہور اسٹیشن پر اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر ہے؛ اتفاق کی بات ہے کہ وہ اس وقت ڈیوٹی پر تھے؛ میں ان سے ملا تو انھوں نے فوراً سیٹوں کا بندوبست کردیا ——— چنانچہ ہم کراچی روانہ ہو گئے۔

جس ڈبے میں ہمیں جگہ دی گئی (تھی)، اس میں ایک مولوی صاحب بھی سوار تھے ——— وہ تسبیح کے دانے پھیر رہے تھے۔

میں نے سوچا کہ یہ تو وبالِ جان ہو جائیں گے، چنانچہ (مجھے) ایک ترکیب سوجھی۔ میں نے نصیر انور سے کہا کہ بھئی ایک بیئر کی بوتل تو کھولو۔

اس نے فوراً سیٹ کے نیچے سے ایک بوتل نکالی اور کھول کر میرے حوالے کردی۔
مولوی صاحب اپنی تسبیح کے دانے پھیرتے ہوئے دوسرے اسٹیشن پر اُتر گئے۔

مجھے یہاں ایک اور لطیفہ یاد آگیا (ہے)
لاہور اسٹیشن پر ہمارے کمپارٹمنٹ میں ایک صاحب اپنی اہلیہ کے ساتھ تشریف لائے ——— صاحب کو تو خیر میں اور نصیر انور برداشت کرلیتے، مگر صاحبہ کو برداشت کرنا بہت مشکل تھا؛ اصل میں وہ ہمیں برداشت نہ کرسکتی تھیں . . .
چنانچہ جب وہ دونوں کمپارٹمنٹ میں داخل ہوئے تو میں نے صاحب سے کہا: "دیکھیے حضرت، ہم شرابی آدمی ہیں . . . بیئر کی پندرہ بوتلیں ہمارے پاس ہیں . . . ہم پئیں گے اور واہی تباہی بکیں گے . . . آپ شریف آدمی ہیں اور غالباً اپنی بیوی کے ساتھ ہیں . . . اس لیے بہتر ہے کہ آپ کسی اور کمپارٹمنٹ میں جگہ تلاش کرلیں . . .
اب کہ میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں تو مجھے طفیل صاحب بتاتے ہیں کہ ان صاحب نے جو اپنی برقع پوش اہلیہ کے ہمراہ تھے، اسٹیشن ماسٹر سے کہا کہ فلاں فلاں ڈبے میں جہاں انھیں جگہ دی گئی ہے، دو بدمعاش بیٹھے ہیں . . .
اسٹیشن ماسٹر نے تعجب کا اظہار کیا اور کہا کہ اُس ڈبے میں تو سعادت حسن منٹو ہے جو کہ بے حد شریف آدمی ہے ——— مگر ان صاحب نے کہا: "جی نہیں . . . اُس نے مجھ سے خود کہا ہے کہ وہ شرابی کبابی ہے . . ."
بہرحال وہ بلا ٹل گئی، وہ یوں کہ ان صاحب کو کسی اور کمپارٹمنٹ میں جگہ دے دی گئی اور ہم بخیر و خوبی ... ہو گئے۔

(لاہور سے) کراچی تک کا سفر نہایت ذلیل ہے؛ سیکنڈ کلاس میں بھی اتنی گرد آتی ہے کہ الاماں ——— بہرحال سفر بیئر کی بوتلوں کی بدولت کٹ ہی گیا۔

میرا خیال تھا کہ کسی ہوٹل میں ٹھیرا جائے، مگر جیب اجازت نہ دیتی تھی ——— میں نے فیصلہ کیا کہ خواجہ سیرالدین کے ہاں ٹھیرا جائے، اس لیے بھی کہ بیوی نے تاکید کی تھی: "دیکھو، میرے بھائی کے پاس جانا . . ."
میں نے سوچا کہ ساری خدائی ایک طرف، جورو کا بھائی ایک طرف ——— میں نے ساری خدائی کو ایک طرف اور جورو کے بھائی کے پاس چلا گیا۔

(خواجہ نصیرالدین) بڑا شریف آدمی ہے، ماشاءاللہ اچھی ملازمت پر ہے، معقول تنخواہ ملتی ہے، بہت بڑے فلیٹ میں رہتا ہے —— اس نے ہماری بڑی آؤ بھگت کی۔ اتفاق سے اس کے ساتھ والا فلیٹ خالی تھا، وہ مجھے اور نصیر انور کو دے دیا گیا۔

مجھے کوئی خواہش نہیں تھی کہ میں وہاں کراچی میں زیادہ دن رہوں، اس لیے کہ بمبئی میں پندرہ برس رہنے کے بعد کراچی میں کوئی کشش نظر نہیں آتی تھی۔

دوسرے دن ہم مجسٹریٹ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔
معمولی سی عمارت تھی —— ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں اڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تشریف فرما تھے۔
مجھ پر لاہور میں کئی مقدمے چل چکے تھے، میں ضلع کچہری کے آداب سے واقف تھا، یعنی (وہ جگہ) جہاں ادب آداب کا کوئی واسطہ ہی نہیں۔
میں مجسٹریٹ صاحب کے حضور سراپا بندگی بن کے کھڑا ہو گیا۔
انھوں نے میری طرف دیکھا، اور پوچھا: "آپ کیا چاہتے ہیں؟"
مجسٹریٹ صاحب کے لہجے کی ملائمی میرے لیے بڑی تعجب خیز تھی —— میں نے عرض کی: "جناب میرا نام سعادت حسن منٹو ہے... آج آپ نے مجھے میرے مضمون 'اوپر، نیچے اور درمیان' کے سلسلے میں فحش نگاری کی دفعہ ۲۹۲ کے ماتحت طلب فرمایا ہے..."
آپ نے مجھے بڑے غور سے دیکھا اور کہا: "تشریف رکھیے!"
میں نے خیال کیا کہ معلوم نہیں، انھوں نے کس سے تشریف رکھنے کو کہا ہے، کیونکہ لاہور کی عدالتوں میں تو ایسا رواج نہیں —— میں کھڑا رہا۔
جب مجسٹریٹ صاحب نے دیکھا کہ میں نے تشریف نہیں رکھی تو انھوں نے دوبارہ کہا: "تشریف رکھیے منٹو صاحب!"
میں ان کے میز کے پاس رکھی ہوئی بنچ پر بیٹھ گیا۔
مجسٹریٹ صاحب تھوڑی دیر کے بعد مجھ سے مخاطب ہوئے: "آپ اتنے دن تشریف کیوں نہ لائے؟"
میں نے عرض کی: "جناب! میری طبیعت ناساز تھی..."
مجسٹریٹ صاحب نے فرمایا: "آپ نے میڈیکل سرٹیفیکیٹ بھیج دیا ہوتا!"
میں نے جھوٹ بولا: "میں اس قدر بیمار تھا کہ میڈیکل سرٹیفیکیٹ بھیجنے کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔"
مجسٹریٹ صاحب نے میرا جھوٹ سنا اور خاموش رہے۔ پھر کہا: "آپ کیا چاہتے ہیں؟"
میں سوچنے لگا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ اصل میں تو میں اپنا چھٹکارا چاہتا تھا —— مجھے بار بار طفیل صاحب کا خیال آتا تھا جنھوں نے میری ضمانت دی تھی اور بعد میں ان کو میری لاابالی طبیعت کے باعث صبح سویرے سیکنڈ کلاس کے دو ٹکٹوں کے ساتھ آنا پڑا تھا۔

میں نے کچھ دیر سوچا اور پھر مجسٹریٹ صاحب سے کہا: "مجھے آپ فارغ کر دیجیے، میں جلدی واپس جانا چاہتا ہوں"
آپ نے فرمایا: "اتنی جلدی تو یہ کام نہیں ہو سکتا۔ . . میں نے آپ کا مضمون ابھی تک نہیں پڑھا ہے . . . انشاء اللہ آج پڑھ لوں گا اور کل صبح فیصلہ سنا دوں گا . . ."
میں نے اور نصیر انور نے ان کو آداب عرض کی اور موٹر سائیکل رکشا میں بیٹھ کر ہیڈ پر چلے گئے —— یہ رکشا مجھے کراچی میں بہت پسند آئی، فٹ فٹ کرتی چلتی ہے، گھنٹوں کا فاصلہ منٹوں میں طے ہوتا ہے، اور کرایہ بھی کچھ زیادہ نہیں ہوتا۔

دوسرے روز ہم عدالت میں حاضر ہوئے۔
مجسٹریٹ صاحب نے میرے سلام کا جواب دیا اور فرمایا: "تشریف رکھیے!"
میں نے بنچ پر تشریف رکھ دی۔
آپ نے ایک چھوٹا سا کاغذ نکالا اور فرمایا: "میں نے فیصلہ لکھ لیا ہے . . ." اس کے بعد انھوں نے ریڈر کی طرف دیکھا اور اس سے کہا: "آج کیا تاریخ ہے؟"
اس نے جواب دیا: "پچیس . . .!"
میں ذرا اونچا سنتا ہوں —— میرے کان ایک عرصے سے خراب ہیں —— میں سمجھا کہ مجھے پچیس روپے جرمانہ ہوا ہے، چنانچہ میں نے مجسٹریٹ صاحب سے کہا: "جناب، پچیس روپے جرمانہ؟"
پچیس روپے جرمانے کا یہ مطلب تھا کہ میں اپیل نہیں کر سکتا تھا، اس صورت میں سزا بحال رہتی۔
مجسٹریٹ صاحب نے غالباً مجھے پانچ سو روپے جرمانہ کیا تھا، مگر جب انھوں نے یہ سنا، "پچیس روپے جرمانہ" تو وہ مسکرائے، قلم لیا اور جرمانہ پچیس روپے میں تبدیل کر دیا۔
نصیر انور نے فوراً جیب سے پچیس روپے نکالے اور ادا کر دیے، اور ساتھ ہی مجھ سے کہا: "سستے چھوٹے ہو، اپیل وپیل کا جھنجھٹ غلط ہوتا، کب تک یہاں عدالتوں کی ٹھوکریں کھاتے رہتے . . . کیا تمھیں 'ٹھنڈا گوشت' کا مقدمہ یاد نہیں . . ."
مجھے "ٹھنڈا گوشت" کا مقدمہ یاد آ گیا اور میں کانپ گیا۔
میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے اتنی جلدی میری خلاصی کر دی۔

میں مجسٹریٹ صاحب کو آداب عرض کر کے جانے ہی والا تھا کہ انھوں نے مجھ سے کہا: "آپ کب واپس جا رہے ہیں؟"
میں نے جواب دیا: "غالباً آج ہی چلا جاؤں گا"
انھوں نے کہا: "نہیں، آج نہ جائیے . . . میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں"
مجھے بہت حیرت ہوئی کہ وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں —— بہر حال میں نے ان سے کہا: "میں کل تک ٹھہر جاؤں گا"
انھوں نے مجھ سے پوچھا: "کل چار بجے آپ سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے؟"
میں جن جن باروں میں جا کر بیئر پیتا رہا تھا، میں نے ان کا نام لے دیا —— وہ پرہیزگار قسم کے آدمی تھے، فیصلہ کافی ہاؤس پر ہوا۔

اپک موتراہی

وقت چار بجے طے ہُوا تھا مگر ہم پندرہ منٹ دیر سے پہنچے۔
مجسٹریٹ صاحب موجود تھے ——— آپ سے رسمی رسمی گفت گو ہوتی رہی۔
تھوڑی دیر کے بعد انھوں نے مجھ سے بڑے پیار سے کہا: "منٹو صاحب، مَیں آپ کو اس دَور کا بہت بڑا افسانہ نگار مانتا ہوں۔۔۔ آپ سے ملنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ آپ یہ خیال دل میں لے کر نہ جائیں کہ مَیں آپ کا مدّاح نہیں۔۔۔"
مَیں سخت متحیر ہوا: "آپ میرے مدّاح ہیں تو جناب آپ نے مجھے جرمانہ کیوں کیا؟"
وہ مسکرائے: "اس کا جواب مَیں آپ کو ایک برس کے بعد دوں گا۔۔"

کئی مہینے گزر چکے ہیں، چند باقی رہ گئے ہیں ——— دیکھیے، مجسٹریٹ صاحب جو اپنے وعدے کے پکّے معلوم ہوتے ہیں، کیا انکشاف فرماتے ہیں۔

پانچواں مقدمہ

تین

سنہ ۱۹۵۲ کا ابتدائی زمانہ تھا۔

میں اپنے کام میں مصروف تھا۔ اجلاس اہلِ معاملہ سے بھرا ہوا تھا۔ اتنے میں میرے پیش کار نے مجھ سے کہا: "ان صاحب کو اپنے کیس کی جلدی ہے۔"

میں نے سر اُٹھا کر دیکھا ——— ایک میانہ قد خوش شکل آدمی، قدرے بیمار مگر زیادہ پریشان، شیروانی کے اوپر کے بٹن کھلے، گلے میں گلوبند لپیٹا، کسی قدر پھنسی ہوئی اور رُکتی ہوئی آواز میں مجھ سے مخاطب تھا: "۔۔۔ میں سعادت حسن منٹو ہوں۔ لاہور سے آیا ہوں۔ بہت بیمار ہوں۔ مجھے جُرم سے اقبال ہے۔ جلد فیصلہ کر دیجیے۔"

ایک اور صاحب منٹو کے پیچھے کھڑے تھے، بالکل اس طرح جیسے منٹو کو حراست میں لیے ہوں۔ یہ ان کے ضامن تھے یا ضامن کے فرستادہ تاکہ منٹو کو اپنے سامنے مقدمہ سے فارغ کرا دیں۔

میں نے کہا: "آپ لوگ تشریف تو رکھیے۔"

منٹو نے کہا: "جی؟"

میں نے پھر کہا: "آپ تشریف رکھیے۔"

منٹو بادلِ ناخواستہ پیش کار کے پیچھے بنچ پر بیٹھ گئے ——— میں نے ان کے مقدمے کی مسل اُٹھائی اور مطالعہ میں مصروف ہو گیا۔

منٹو پر الزام تھا: "اُوپر، نیچے اور درمیان" لکھنے کا اور شایع کرنے کا ——— مجھے ان کے مقدمے کا علم کچھ عرصے سے تھا اور میں نے اس کے لیے اپنے آپ کو تیار کیا ہوا تھا۔

میں نے ادبی مشاغل کبھی ترک نہیں کیے مگر افسانوی ادب، خصوصاً اردو افسانوی ادب کے متعلق میرا علم حاضر نہ تھا۔ اس لیے میں نے دو چار ماہ افسانے ہی افسانے پڑھے۔ منٹو کے مضامین کے جتنے مجموعے مل سکے، ان کا بغور مطالعہ کیا۔ البتہ اس خاص افسانے اور تنقیدوں کے پڑھنے سے، احتراز کیا۔ یہ اس لیے کہ میں پہلے سے کوئی رائے قائم نہ کر لوں ——— اب آپ اندازہ کیجیے کہ جب منٹو نے اقبالِ جرم کی آڑ لی تو مجھ پر کیا گزری ہوگی؟

اس درمیان میں میں نے منٹو کو کنکھیوں سے دیکھنے کی کوشش کی مگر وہ بنچ سے غائب تھے ———

وہ بے تابی سے اجلاس کے باہر برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔
وہ پھر اندر آئے اور کہنے لگے: "اب میرا کیس ختم کیجیے۔"
میں نے کہا: "بہت اچھا۔ . . آپ تشریف تو رکھیے۔" یہ کہہ کر میں نے مقدمات سرسری کے رجسٹر کی خانہ پری شروع کر دی۔
منٹو بنچ پر بیٹھے تھے مگر برابر پہلو بدل رہے تھے۔
اندراجات ختم کر کے میں نے حسبِ ضابطہ ان کا اقبالِ جرم قلمبند کیا —— سب کا خیال تھا کہ میں فوراً بھاری سا جرمانہ عائد کر دوں گا۔ مگر منٹو کو خصوصیت سے بڑی ناامیدی ہوئی جب میں نے کہا: "منٹو صاحب، میں تجویز کل سناؤں گا۔"
وہ مصر ہوئے کہ حکم فوراً دیا جائے —— ان کے خیال میں، ان کے اقبال اور مجسٹریٹوں کے وجود کا مقصد ہی فوت ہوا جا رہا تھا۔ اور میں چاہتا تھا کہ افسانہ پڑھ لوں، اس پر غور کروں۔ یہ جانچ لوں کہ وہ قانون کی تعریف کے لحاظ سے واقعی فحش ہے یا نہیں۔ یقین کیجیے کہ حقیقی انصاف میں خلوصِ فکر و عمل کو بڑا دخل ہے۔ خودرائی اور لفظی ضابطہ پرستی انصاف کے منافی ہیں۔ یہ محض رنگِ زمانہ ہے کہ جوہر، عرض پر قربان کر دیا جاتا ہے۔
قصہ مختصر، منٹو کو قہرِ درویش برجانِ درویش، دوسرے دن تک انتظار پر آمادگی ظاہر کرنا پڑی۔

دوسرے دن اجلاس پر بیٹھ کر میں نے مختصر سی تجویز لکھی —— منٹو معہ اپنے ساتھی کے اسی طرح عالمِ بے تابی میں حکم سننے آئے تھے —— میں نے پوچھا: "منٹو صاحب، آپ کی مالی حالت کیسی ہے؟"
کہنے لگے: "بہت خراب۔"
میں نے پوچھا: "آج تاریخ کیا ہے؟"
کسی نے کہا: "پچیس۔ . ."
میں نے کہا: "منٹو صاحب، آپ کو پچیس روپیہ جرمانہ۔ . ."
پہلے وہ سمجھے نہیں، پھر اپنے دوست سے کہنے لگے: "یہ تاریخ پوچھتے ہیں یا فیصلہ سناتے ہیں۔"
مگر ضامن صاحب زیادہ مستعد تھے، وہ فوراً جرمانہ ادا کرنے چلے گئے —— اور منٹو پھر برآمدے میں ٹہلنے لگے۔
کچھ دیر بعد مجھے منٹو اور ان کے ساتھی پھر کمرے میں نظر آئے۔ میں نے کہا: "ارشاد۔ . ."
ان کے ساتھی نے فرمایا: "ہم لوگ آپ کو تکلیف دینے آئے ہیں۔ . ."
میں نے بلا کسی تکلف کے ان کی دعوت قبول کر لی —— اجلاس پر بیٹھ کر کسی رسمی ردوقدح کا موقع نہیں رہتا اور پھر میں تو خود منٹو سے بے تکلف ملاقات کا خواہش مند تھا، کیونکہ میری دانست میں منشی پریم چند کے بعد منٹو اردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار تھا۔

میں شام کو سیدھا دفتر سے زیلن کافی ہاؤس پہنچ گیا —— کافی ہاؤس کھچا کھچ بھرا تھا۔ میں

سیڑھیوں کے قریب منتظر تھا کہ منٹو اور ان کے ساتھی آ گئے۔

منٹو سرخوش تھے مگر بالکل ہوش میں۔ بات کرتے کرتے البتہ رُک جاتے مگر تسلسلِ کلام نہ ٹوٹتا۔ کبھی مجھ سے مخاطب ہوتے، کبھی بیچ میں اپنے ساتھیوں سے میرے اُوپر تنقیدی جملے کہتے جاتے، مگر ہر لفظ خلوص میں ڈوبا، تصنع سے پاک تھا۔ دماغ اور خیالات میں کوئی محفوظات یا مغالطے پوشیدہ نہ تھے۔ گفتگو میں نہ مرعوب کرنے کی خواہش تھی نہ مرعوب ہونے کی۔ اچھے کو اچھا اور بُرے کو بُرا کہنے میں کوئی باک نہیں تھا —— انھوں نے اچھے اور بُرے کا جو معیار قائم کر رکھا تھا، وہ رسوم و قیود سے آزاد تھا، مگر تھا ایک مستقل معیار جو زمانے کے ساتھ بدلنے والا نہ تھا —— غرض، اس وقت مجھے اپنی عُمر میں پہلی مرتبہ ایک حقیقت پرست بے ریا اور بے باک، بلند پایہ آرٹسٹ کا ایسا نقشہ نظر آیا جو آج تک دل اور دماغ میں محفوظ اور زندہ ہے، اور زندگی بھر رہے گا۔

گفتگو طویل تھی مگر دلچسپ —— کہنے لگے: "آپ شراب نہیں پیتے؟"

میں نے کہا: "جی نہیں . . ."

"مُلا ہیں . . ."

"جی نہیں . . . مسلمان۔"

ہنسنے لگے —— ان کے ساتھی نے میرے لیے کافی منگوائی۔

مجھے معلوم ہوا کہ یہ لوگ کسی بار سے دلچسپ صحبت چھوڑ کر محض میری خاطر کافی ہاؤس آئے ہیں۔ میں نے معذرت کی کہ "دراصل میزبانی تو مجھے کرنی چاہیے تھی کہ میں مقامی آدمی ہوں . . ."

منٹو نے کہا: "جی نہیں، آپ تو مہاجر معلوم ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا: "پھر بھی ہوں تو میں کراچی میں . . ."

پھر مجھ سے پوچھنے لگے: "آپ نے ہمیں اجلاس پر بیٹھنے کے لیے کیوں کہا۔ مجھ سے تو کسی مجسٹریٹ نے ایسا برتاؤ نہیں کیا۔"

میں نے جواب دیا: "میں بداخلاقی کو عدالتی آداب کا جزو نہیں سمجھتا۔"

اس پر فوراً ہنسے اور اپنے ساتھی سے کہنے لگے: "آدمی شریف معلوم ہوتا ہے۔"

کچھ دیر بعد کہنے لگے: "میں نے آپ کی تجویز نہیں پڑھی۔ کیا لکھا ہے آپ نے؟"

میں نے ان کے ہاتھ میں نقل دے دی —— وہ غور سے پڑھتے رہے، اور پھر ختم کرنے کے بعد اپنے ساتھیوں سے اس طرح مخاطب ہوئے گویا میں موجود نہیں ہوں: "پڑھا لکھا آدمی ہے . . . بہت پڑھا لکھا ہے . . . اچھا جی، آپ نے کہاں تک تعلیم پائی ہے؟"

میں نے اپنی تعلیمی اسناد سُنائے۔

پھر ہنسے، اور کہنے لگے: "دیکھا نا، میں نے کہا تھا، بہت پڑھا لکھا ہے۔ اور انگریزی اچھی لکھتا ہے۔ بہت اچھی . . . . . . کیوں جی، آپ نے مجھے سزا کیوں دی؟"

مجھے اس وقت احساس ہوا کہ یہ شخص پکّا آرٹسٹ ہے —— منٹو کو احساس نہ تھا کہ انھوں نے کوئی فحش چیز لکھی ہے، انھوں نے تو بس ایک افسانہ لکھا تھا۔

انھوں نے مجھے بتایا کہ وہ افسانہ بڑی حد تک واقعات پر مبنی تھا۔ وہ کہتے رہے کہ اگر یہ افسانہ فحش ہے تو وہ کیا کریں، وہ واقعہ ہی فحش تھا۔ آج کل کی سوسائٹی خود فحش ہے۔ وہ صرف عکاس ہیں اور آئینہ پر بُرے چہرے والوں کو غصہ آیا ہی کرتا ہے —— انھوں نے کہا کہ انھوں نے ایک لفظ بھی فحش استعمال نہیں کیا۔ اور یہ بالکل امر واقعہ تھا۔

ان کی بحث کا جواب میں اسی جوش اور صراحت سے دینے کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ میں نے ٹالنے کے لیے کہا:

"محض فحش الفاظ ہی معیار نہیں ہوتے۔"

کہنے لگے: "پھر کیا معیار ہے۔ حقیقت چھپائی جائے۔ . . . آپ مجھے سچ بولنے پر سزا دیتے ہیں۔"

اس وقت گو میں نے کوئی صاف جواب دینا مناسب خیال نہیں کیا، لیکن حقیقت اور اظہارِ حقیقت میں کچھ نہ کچھ فرق ہوتا ہی ہے اور رکھا ہی جاتا ہے، ورنہ ستر پوشی کا کیا جواز ہے۔ وظائف جنسی کی ادائی کے لیے انسان خلوت کیوں ڈھونڈتے ہیں؟ رمزیت اور فنکارانہ متانت کو ادبی محاسن میں کیوں شمار کیا جاتا ہے؟ ادیب فوٹوگرافر نہیں، پینٹر ہوتا ہے۔ فوٹوگرافر بھی اعضا اور افعالِ جنسی کی تصویریں نہیں لیتے پھرتے —— میں نے انھیں پھر ٹال دیا: "یہ میں آپ کو پھر کبھی بتاؤں گا کہ میں نے کیوں سزا دی؟"

منٹو نے کہا: "آپ وعدہ کیجیے۔"

میں نے کہا: "وعدہ ہے۔ . ."

میں منٹو کی زندگی میں یہ وعدہ پورا نہ کر سکا، مگر آج کر رہا ہوں:

قانون یہ نہیں چاہتا کہ ادب اپنے تقاضوں کو یا مقاصد کو پورا نہ کرے۔ قانون یہی چاہتا ہے کہ ان مقاصد کو انسان کے لیے مفید ہونا چاہیے۔ اگر مقصد مفید نہ ہو، یعنی خالی شہوانی جذبات کو برانگیختہ کرنا مقصود ہو، یا شہوانی جذبات کو برانگیختہ کرنا مقصود تو نہ ہو مگر موضوع یا الفاظ ایسے ہوں جن سے کمزور، مریض یا ناپختہ ذہن شہوانی لذت کشی میں مبتلا ہو جائیں تو قانون اس عبارت کو غیر مفید اور فحش قرار دیتا ہے۔ "اوپر، نیچے اور درمیان" میں فعلِ جنسی کے مبادیات اور پس منظر کا تذکرہ ہے۔ سوسائٹی کے تین طبقوں میں یہ امور کتنے مختلف ہوتے ہیں، یہ ان کی تفصیل ہے۔ قانون کی رائے میں یہ موضوع کچھ مفید نہیں، خواہ یہ واقعات صحیح ہوں۔ قانون یہ بھی سمجھتا ہے کہ عام ذہن، سماجی طبقات کے اختلافات کی عکس کشی کا حسن دیکھنے کی جگہ جنسی تلذذ میں مبتلا ہو جائیں گے۔ قانون کا یہ اندیشہ اور یہ رائے کچھ ایسی غلط تو نہیں۔ ممکن ہے بلکہ یقین ہے کہ ادیبوں کو میری اس رائے سے شدید اختلافات ہوں گے۔ میں فحاشی کے قانونی معیار کو اس سے زیادہ صراحت سے واضح نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس معیار کی صحت کا کوئی بہتر جواز پیش کر سکتا ہوں —— حقیقت یہ ہے کہ میں ادبی نقطۂ نظر سے بھی اس افسانے کو فحش سمجھتا تھا لیکن

اس وقت اس تفصیل میں جانے کا محل نہ تھا۔

ڈیڑھ دو گھنٹے کافی ہاؤس میں صحبت گرم رہی ——— جہاں منٹو نے مجھ سے ایک وعدہ لیا تھا وہیں انھوں نے خود بھی مجھ سے ایک وعدہ کیا تھا مگر اس کی تکمیل کا انھیں بھی موقعہ نہیں ملا۔

یہ تھی میری اور منٹو کی پہلی اور آخری ملاقات ——— پھر لاہور سے ان کے دو تین خط آئے میں نے حتی الوسع ان کے احکام کی تعمیل کی کوشش کی۔ کسی خط میں ان کی کوئی ذاتی غرض وابستہ نہ تھی۔ وہ احباب پرست تھے اور قدر دان دوست تھے۔ ان کے خط اسی سلسلے کے ہوتے۔ ان کا آخری خط میرے نام ۱۷ جنوری ۱۹۵۵ء، یعنی انتقال سے ایک دن پہلے کا لکھا ہوا ہے۔ یہ خط مجھے ان کے انتقال کے بعد ملا۔

منٹو کے اور میرے مختصر مگر پُرخلوص تعلقات کی عزیز ترین نشانی ایک اور ہی چیز ہے ——— "اوپر، نیچے اور درمیان" کے مقدمے کا حال انھوں نے "پانچواں مقدمہ" کے عنوان سے "نقوش" میں لکھنا شروع کیا۔ اس کی صرف پہلی قسط چھپی تھی جس میں عدالت میں پہنچنے تک کا واقعہ آیا ہے۔ معلوم نہیں، یہ مضمون وہ مکمل کر سکے یا نہیں۔ اس مضمون کے دوسرے حصے میں وہ یقیناً میری ذات سے متعلق اپنے خیالات ظاہر کرتے ——— میں نے پہلی قسط پڑھی تھی اور مجھے دوسری قسط کا انتظار تھا ——— اس انتظار کی مدت بڑھتی گئی۔

۱۹۵۴ء کے آخری زمانے میں مجھے معلوم ہوا کہ منٹو نے ایک تازہ مجموعۂ مضامین شایع کیا ہے جس کا نام ہے: "اوپر، نیچے اور درمیان" ——— مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی جب لوگوں نے بتایا کہ منٹو نے یہ مجموعہ میرے نام سے معنون کیا ہے۔ ان کی پُرخلوص محبت اور بے تکلف اعتبار کا اس سے بہتر ثبوت ملنا مشکل ہے۔ میں ایک غیر معروف سا آدمی خوش ہوں کہ شاید یونہی میرا نام "نوادرِ ادبی" کے روپ میں کچھ دنوں ادبی دنیا میں رہ جائے

آخری خط

مکرمی و معظمی مہدی علی خان صاحب،

تسلیمات۔ مجھے افسوس ہے کہ اس دوران میں آپ سے خط و کتابت نہ کر سکا۔ دراصل میں علیل تھا۔

میں آپ سے کوئی نہ کوئی سفارش کرتا ہی رہتا ہوں، صرف اس لیے کہ مجھے آپ کے خلوص اور آپ کی محبت نے بہت متاثر کیا تھا، اور میں اپنی دانست کے مطابق یہ سمجھتا ہوں کہ آپ میری سفارش کو کبھی رد نہیں کریں گے۔

حامل رقعہ رفیق چوہدری صاحب میرے عزیز ہیں۔ ان پر آپ کی کرم فرمائی مجھ پر بہت بڑی کرم فرمائی ہو گی۔ یہ آپ کو زبانی تمام حالات بتا دیں گے۔

میرے لائق کوئی خدمت؟

میرا ارادہ ہے کہ چند دنوں کے لیے کراچی آؤں۔ امید ہے آپ سے ملاقات ہو گی۔

نیاز کیش

سعادت حسن منٹو

۱۷ر جنوری ۱۹۵۵ء

دستاویز

آخری لفظ

سچ کے کئی اسلوب ہوتے ہیں:
لباس، وضع قطع، روزمرہ زندگی کے طور طریقے:
گفتگو، تقریر، تحریر؛
اقدار، عقاید، افکار۔
سچ کے کئی اور روپ بھی ہیں:
انکار، احتجاج، بغاوت، انقلاب۔
اقرار، قبولیت، سپردگی، شکست۔
اور وہ لسانی ڈھانچہ
جس میں ادب لکھنے والے کا جمالیاتی رویہ اور وژن
اپنی پہچان قائم کرتا ہے،
بھی سچ کا ایک اسلوب ہے۔

دستاویز

وقت بھی سچ ہے۔
وقت نہ تو تاریخی کا تسلسل ہے،
نہ تاریخ و تہذیب کے کسی ان دیکھے راستے پر ایک اندھی دوڑ؛
وقت ایک غیبی، ماورائی، الوہی طاقت بھی نہیں ہے۔
وقت تو ایک رزم گاہ یا کرم بھومی ہے۔
وقت ایک بے انت سلسلہ ہے
جس کی مالا میں اشخاص، واقعات اور افکار
منکوں کی صورت پروئے ہوئے ہیں؛
وقت ایک توانائی ہے،
کبھی نہ ختم ہونے والی۔
اس توانائی کو غذا ملتی ہے
زندگی کی اس جدلیات سے جو ارتقا پذیر ہے۔

وقت سچ ہے۔
آدمی سچ ہے۔
آدمی وقت کے تعین اور اس کی میزان کا بنیادی وسیلہ ہے۔

منٹو
ادب لکھنے والا ایک آدمی تھا،
ایک سچ تھا
جو مملکتِ فرنگ اور مملکتِ خداداد کے
روایت زدہ اور اخلاق باختہ
قوانین سے عمر بھر لڑتا رہا ——
معاشرتی تعصبات کے ماروں نے
جو سچ کے وجود سے انکار کے عادی تھے،
منٹو کو مجرم جانا۔

وہ آج بھی ہمارے ساتھ ہے
اور کل
وہ جو ہمارے بعد آئیں گے،
اسے اپنے ساتھ پائیں گے۔